قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل الاشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۴۸ روپے

غیر ممالک —— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون

87 92 46

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

۴

چار روپے

جلد (۴۱) — مارچ ۱۹۸۸ء — نمبر ۳

فہرست

۱	لمعات	۲
۲	بانیٔ پاکستان کے اصول	۱۲
۳	المیزان (محترمہ ثریا عندلیب)	۱۴
۴	رسولوںؑ کی تشریف بری کے بعد امتیوں کا طرزِ عمل (خاکہ)	۱۸
۵	کیا اصلاحِ احوال کے لئے تشخیصِ مرض کافی ہے!؟ (محمد عمر دراز)	۳۰
۶	انکارِ پرویز کی صدی	۳۲
۷	حقائق و عبر	۳۲

(۱) طلاقِ بدعت اور اہلِ حدیث علماء (۲) طلاقِ بدعت کے معاشرے پر اثرات ہیں (۳) سستی بہشت (۴) بے خبر ز مقامِ محمد عربی است (۵) مدیر ماہنامہ منہاج القرآن کا شکریہ (۶) اسلامی نظام کے علمبرداروں کے نزدیک بیوی کا مقام (۷) اطاعتِ رسول فرض ہے۔ (۸) جاگیرداروں کے بارے میں جماعتِ اسلامی کی نئی قرارداد۔ (۹) خلافِ مزاج احادیث کا انکار

۸	حُسنِ تحریر	۴۱
۹	سر سید احمد خاں بحیثیت ایجوکیشنسٹ (شمیم انور)	۴۴

ایڈیٹر: محمد طفیل، ناشر: شیخ عبدالمجید، مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۲/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

> "آج کل پاکستان میں شدّ و مد سے تصوف پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے کون سے ہاتھ کارفرما ہیں اور اُن کے سامنے کون سا ہدف ہے؟"

اسلام، خدا اور بندے کے درمیان کسی روحانی تعلق کا نام نہیں، یہ ایک **نظامِ حیات** ہے جو اپنی آزاد مملکت میں متشکل ہوتا اور قائم رہ سکتا ہے۔ اسی شجرِ طیب کی دوسری شاخ یوں کہیے یہ ہے کہ لوگ اسلام کی اس حقیقت کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ باقی دُنیا سے الگ، رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلافات کے علی الرغم ایک منفرد قوم بن جاتے ہیں۔

دین کی اسی اساسی حقیقت کا اعلان، علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے، ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ میں فرمایا:۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک **تمدنی قوت** کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔۔۔۔۔ اس سے اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں، ان سے مخلصی حاصل کر لے اور اپنی تعلیم اور اپنے تمدن کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے قریب تر لا سکے"

انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائداعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ:۔

"اس ملک میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور فروغ کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں ایک سے زیادہ آزاد اسلامی مملکتیں قائم ہوں"

اس ... کے مطابق، مارچ ۱۹۴۰ء میں، پاکستان ... ریزولیوشن پاس

جس سے ہندی مسلمانوں کی منزل کا تعین ہوا اور قائداعظم کی قیادت میں کاروانِ ملت حصولِ پاکستان کی کوشش میں جادہ پیما ہوا۔ اس نظریۂ قومیت کا، اُس وقت سب سے بڑا مخالف مسٹر گاندھی تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کی تحریک آزادی کا سب سے بڑا رہنما تھا، اُس کی قوم نے اُسے مہاتما کا درجہ دے رکھا تھا۔ اُس نے پاکستان ریزولیوشن پاس ہونے کے فوراً بعد، اپریل ۱۹۴۰ء میں، ایک مبسوط مضمون میں اس کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس نے کہا:

"دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا اُن کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے...... میری رُوح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت، دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے اور ہم سب ایک ہی خدا کے عیال ہیں، خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے، اپنی قومیت بدل لیں۔"

(ہندوستان ٹائمز، اپریل ۱۹۴۰ء)

اس کے بعد، پنڈت جواہر لعل نہرو کی باری آتی ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات "میری کہانی" میں لکھا ہے کہ:

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر دوسری قوم موجود ہے...... سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت دُور از کار بات ہے...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے۔"

(میری کہانی۔ حصہ دوم صد ۳۴۲)

اس کے ایک ہی صفحہ بعد لکھا ہے کہ:

"مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقائق سے دوچار ہونے کے بعد اسکا خاتمہ ہو جاتا۔"

(ایضاً۔ صد ۳۴۳)

طلوعِ اسلام لاہور

ازاں بعد انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۴۷ء کے خطبۂ صدارت میں بصد حسرت و تأسف کہا کہ

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"

ہندو لیڈروں کے بعد مسلمانوں کے لیڈروں کی طرف آئیے۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد مرحوم مسلمان لیڈروں کے سرخیل اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی دس قدم آگے تھے۔ جب مسلم لیگ نے طے کیا کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور کی جائے گی تو ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ اس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لئے (مولانا) ابوالکلام آزاد کو صدر منتخب کیا جائے تاکہ جو کچھ مسلمان اپنے ہاں طے کریں، اُس کی مخالفت خود ایک مسلمان ہی کی زبان سے کرائی جائے۔ چنانچہ (مولانا) آزاد نے اپنے صدر منتخب ہونے کے بعد، لاہور میں، اپنی پہلی تقریر میں فرمایا کہ:-

"مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں، ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں اس باب میں ان سے متفق نہیں۔"

(اسٹیٹسمین - ۱۹، فروری ۱۹۴۰ء)

اس کے بعد انہوں نے کانگریس کے اجلاس (منعقدہ رام گڑھ) میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ یہ خیال کہ ہندوستان میں، ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں آباد ہیں، انگریزی سامراج کا پیدا کردہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس کی سرزمین، انسانوں کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد دوسرا یہ سلسلہ جاری رہا..... انہی قافلوں میں ایک حجازی قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا جو پچھلے قافلوں کے نشاناتِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر، جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ ظہور میں آیا، اُسی دن قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کو ڈھالنا شروع کر دیا۔"

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فرمایا کہ:-

ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے

...سے بچے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ تجزیہ عمل ہو چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہو جانا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کے لئے یہ کون سا نسخہ ہے جسے (کسی زمانے کے) "امام الہند" حضرت (مولانا) ابوالکلام آزاد تجویز فرما رہے ہیں۔ یہ وہی نسخہ ہے جسے (ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں) مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا۔ یہ اُسی ناقوسِ برہمن کی صدائے بازگشت ہے۔

انہی دنوں، بنگال سے برہمو سماجی تحریک اُٹھی (جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام مذاہب کے امتیازات مٹا کر ایک نیا عالمگیر مذہب وضع کیا جائے جو جملہ مذاہب کی "عالمگیر سچائیوں" کا مجموعہ ہو) اس کے ایک مشہور رہنما شری کیشب چندر سین گپتا کی، شروع ۱۹۳۹ء میں برسی منائی گئی۔ اس پر تقریر کرتے پنڈت نہرو نے کہا۔

"ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ ان ہر دو متضاد تصوراتِ زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ گرونانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا...... اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا لیکن قبل اس کے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان آپہنچی۔" (لائٹ۔ ۱۷ فروری ۱۹۳۹ء)

یعنی متحدہ قومیت اور سیکولر نظامِ حکومت کی کامیابی کی صورت یہ ہوگی کہ ہندومت اور اسلام کے امتزاج سے ایک نیا برہمو سماجی مذہب وضع کیا جائے۔ تاکہ

کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

طلوعِ اسلام نے، اس کے خلاف، اس زمانے میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا "سوراجی اسلام"۔ اس نے کانگریس کے اس جدید فریب کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

مسلمانوں کو اپنے مذہب سے جس قدر وابستگی تھی، اس کے پیشِ نظر یہ محسوس کیا گیا کہ وہ اس قسم کے برہمو سماجی اسلام کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا سوچا گیا کہ اسے ایسے رنگ میں پیش کیا جائے کہ مسلمان یہ کہیں نہیں بلکہ اُسے اصل اسلام بلکہ مغزِ اسلام سمجھیں۔ اس سلسلہ میں دیوان لال چند

لعل رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:۔
"تصوّف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رُو سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ہند قومیت واحدہ کے رشتے میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف راہ نمائی کر سکتی ہے"۔
(نیشنل کال۔ ۲۶ مارچ ۱۹۳۹ء)

مولانا عبید اللہ سندھی انہی دنوں، قریب بیس سال کی جلاوطنی کے بعد، ہندوستان واپس آئے۔ وہ بڑے پرانے قومیت پرست تھے اور ماسکو وغیرہ کی سیاحت سے ان کے ذہن میں کمیونزم کے جراثیم بھی پرورش پا رہے تھے۔ انہوں نے جمعیت العلماء کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور تجویز کیا کہ اسے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک شعبہ کے متعلق لکھا کہ:۔
"جمعیت العلماء کے اس شعبہ کو اسلامی فلاسفی کا محافظ ہونا چاہیئے۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہندو فلاسفی ہے جسے مسلمان صوفیائے کرام نے ہندوستان میں تکمیل کے درجہ تک پہنچا دیا ہے"۔
(طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۳۹ء)

ہندوستان میں ہندوؤں کا آخری حربہ یہ تھا کہ ملک میں ایک ایسے نئے مذہب کو رائج کیا جائے جس میں ہندومت اور اسلام کا امتیاز ختم ہو جائے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس کے لئے ہمارے پاس **تصوّف** کی بنیاد پہلے سے موجود ہے۔ یہ بڑا خطرناک حربہ تھا۔ قیامِ پاکستان نے ہمیں اس سے بچا لیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، نظریۂ پاکستان (یعنی اسلام کی بنیاد پر حکومت کا قیام)، اور دو قومی نظریہ (یعنی ایمان کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل)، کے خلاف ملک میں جو خیالات پھیلائے جا رہے ہیں، اُن میں تشکیل پاکستان سے شکست خوردہ دیگر مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے علاوہ، مسٹر جی ایم سیّد سرِفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ ۱۹۷۲ء میں "جیسا کہ میں نے دیکھا" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں وہ وحی کے عقیدے کو توہم پرستی قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"صحیح ترین تصوّرِ حیات تصوّف ہے جس کا اہم اصول وحدتِ مذاہب ہے (ان الفاظ کو بار بار پڑھیئے اور دیکھیئے کہ اس کے ڈانڈے دیوان لال چند ناول رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو کے بیانات سے کس طرح جا ملتے ہیں)۔

"تصوف عدم تشدد یا اہنسا کا حامی ہے۔ وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصور نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔" (صـ ۲۰۶-۲۰۵)

آخر میں وہ مقصد بھی سن لیجئے جس کیلئے تصوف کو اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سید صاحب اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتے ہیں۔

"صوفی، مذاہب و عقیدہ کی بنا پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے۔ اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی نظریۂ حیات اور نظریۂ قومیت کو باطل قرار دینے کے لئے کن کن راستوں اور کس قسم کے حربوں سے یورشیں کی جا رہی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا اسمِ گرامی، صفحاتِ تاریخ پر، خالقِ تصورِ پاکستان کی حیثیت سے جگمگ جگمگ کر رہا ہے جس کے قیام و استحکام کے صدقے آج ہم آزاد قوموں کی صف میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں لکھا ہے۔

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔"

(تصوف کی حقیقت صـ ۲۸۰ از محترم غلام احمد پرویزؒ)

اور علامہ اقبالؒ کے عطا کردہ تصورِ پاکستان کی بنیادوں پر، اپنا خونِ جگر تک شامل کر کے، ہم نااہلوں کیلئے مملکتِ پاکستان حاصل کرنے والے بطلِ جلیل حضرت قائداعظمؒ نے تحریکِ حصولِ پاکستان کی چومکھی لڑائی جیتنے کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی تھی۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے نہ صرف یہ کہ پاکستان ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے — یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برِصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔"

(تقاریر قائداعظمؒ جلد اوّل صـ ۲۹۷)

لیکن وائے قسمت! کہ اسی پاکستان کے دم سے عزت و آبرو پانے والے اور اسی پاکستان کے وجود سے مناصب جلیلہ حاصل کرنے والے، آج اس مملکت میں ایسی سرگرمیوں کی پرورش کر رہے ہیں جن سے اس مملکت کی بقا کو بڑے مہیب خطرات درپیش آ رہے ہیں اور اس کے قیام کی خاطر بے بہا قربانیاں دینے والے یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا یہ تمام بے سود تھا، بے مقصد تھا؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کفرانِ نعمت ہو سکتا ہے؟ اور ساتھ ہی اُن کی نگاہیں بار بار اُس قادرِ مطلق کی جانب انتہائی بے بسی کی ان دعاؤں کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ:

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ ۴/۷۵

ہمارے لئے اپنی جناب سے کوئی محافظ و نگران، کوئی سرپرست و مددگار بھیج"

وہاں سے انہیں یہ جواب ملتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔ ۱۳/۱۱

"یہ حقیقت ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے"

اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی کہ:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ......

تم جس طرح جی چاہے کرو۔

لیکن یاد رکھو!

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۴۱/۴۰

جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں، اُسے دیکھ رہا ہے"

وہ مالکِ کُل یہ کہتا ہے کہ:

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ...... ۳/۱۲۹

اس کے ہاں سے سامانِ حفاظت اُسے ملتا ہے جو حفاظت پانا چاہے"

اُس نے کہا کہ ہماری حفاظت کی طلب و جستجو کے ساتھ ضروری ہے کہ تم ایسے صالح اعمال کرو جو تمہیں تمہارے غلط کاموں کے تباہ کن نتائج سے بچا لیں:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ...... ۱۱/۱۱۴

" اچھے کاموں کے خوشگوار نتائج، غلط کاموں کے نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں "

اور یہ کہہ کر وہ اس مملکت کو بچانے کی ذمہ داری ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس مملکت میں ہم پر خدا کا عذاب تباہی بن کر نازل نہ ہو تو اس کے لیے صرف لفظی دعائیں مانگنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو یہ کہنے سے اس سے چھٹکارا مل سکے گا کہ میں اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ کیونکہ اپنے غلط کاموں اور بےعملیوں کے اعتراف کے بعد، ہمیں نیک نیتی اور دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اُن راستوں پر چلنا ہوگا جو اللہ کے متعین کردہ صراطِ مستقیم کی طرف جاتے ہیں۔ اُس کا وعدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۲۹/۶۹

"جو لوگ اس مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں جو ہم نے اُن کے لئے متعین کیا ہے، اُن کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، جو ہر طرف سے آکر صراطِ مستقیم میں مل جاتی ہیں اور اس طرح انسانی سعی و کاوش کا رُخ ہمارے متعین کردہ پروگرام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں خدا کی تائید و نصرت حاصل رہتی ہے۔"

اسے اچھی طرح سمجھ رکھئے کہ "حسنات" کرنے کیلئے ہمارے پاس "تا ابد" وقت نہیں ہے۔ اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل، بڑا ہی سخت گیر واقع ہوا ہے۔ اگر ہم نے اپنی اصلاح (توبہ) اُس کے حرکت میں آنے سے قبل نہ کر لی تو ہم میں سے کوئی نہیں بچ سکے گا اسلئے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۴/۱۷)

"[illegible] کی طرف سے معافی انہیں ملتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول کرتے ہیں) جو غلطی سے کوئی جرم کر بیٹھیں اور پھر اس کا احساس پیدا ہونے پر فوراً اصلاح کی طرف لوٹ آئیں۔ [illegible] کے قانون میں معافی انہی کے لئے ہے اس لئے کہ اس کا قانون علم و حکمت پر [illegible] ہے۔"

(مفہوم القرآن صفحہ ۱۸۱)

[illegible] التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ

الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ .... (۴/۱۸)
اُن کے لئے معافی نہیں جو عادی مجرم ہوں اور اپنی حرکات پر اس وقت نادم ہوں جب موت اُن کے سامنے آکھڑی ہو (یعنی اصلاحِ عمل کا وقت باقی نہ رہے)...... (مفہوم القرآن ص۱۸۱)

قارئین کرام!

آپ نے اسلام کا نظریۂ قومیت ملاحظہ فرمالیا!
اس نظریۂ قومیت کو تصورِ پاکستان کی شکل میں اُبھار اور نکھار کر سامنے لانے والے عظیم اسلامی مفکر علامہ محمد اقبالؒ کی، حصولِ پاکستان کی توجیہہ بھی دیکھ لی!
اس تصورِ پاکستان کے مطابق، مملکتِ پاکستان حاصل کرنے والے بطلِ جلیل حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے، پاکستان کے قیام سے حاصل ہونے والے مقاصد سے متعلق ارشادات بھی آپ کی نظروں کے سامنے آگئے!
اِن محسنینِ ملّتِ اسلامیہ کی عمر بھر کی یہ مساعیٔ جمیلہ، ختمی مرتبت حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظامِ خداوندی کے قیام کی سُنّتِ کبریٰ اور رب العالمین کے اس ارشاد کی اطاعت میں تھیں کہ:۔
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)
اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو (ضابطۂ) ہدایت اور دینِ حق (الاسلام) دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ وہ، اسے تمام نظام ہائے حیات پر غالب کر دے، چاہے یہ بات مشرکین کو (یعنی اُن لوگوں کو جو اللہ کے نازل کردہ ضابطۂ زندگی، قرآن العظیم، کے ساتھ اوروں کے خود ساختہ قوانین ملاتے ہیں)، کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے!

اِن کے برعکس، مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، دیوان لال چند ناول رائے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر جی۔ایم۔ سیّد (؟)، کے نقطہ ہائے نظر، اسالیبِ سیاست اور اُن سے حاصل ہونیوالے اہداف سے آگاہی بھی آپ نے حاصل کر لی!
اب ہم آپ سے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ سوچیں کہ آج مملکتِ خداداد پاکستان میں اس شدومد سے **تصوف** کی تبلیغ کے پیچھے کون سے ہاتھ کارفرما ہیں اور اس سے وہ کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس **غارت گرِ ملّتِ** اسلامیہ کے سدِباب کے لئے آپ پر کیا ذمہ داری

...ہوتی ہے کہ پاکستان صرف ہمارا ہی نہیں ہے، ہماری آنے والی نسلوں کی بھی امانت ہے اور اس ...مملکت کو حفاظت وسلامتی کے ساتھ ان تک منتقل کرنا ہم پر مقدس فریضہ ہے۔ کیوں کہ ہم نہیں تو شاید وہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کے مقرر فرمودہ سانچے میں ڈھال پائیں۔

یہ بات ہم سب کے سمجھ لینے کی ہے کہ اس مملکت میں اللہ کے تختِ اجلال بچھانے کا امکان اُسی وقت تک ہے جب تک اس کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں محفوظ و مصئون ہیں!

آپکی

ہر قسم کی طباعت اور پیکنگ کی ضروریات

کیلئے آپ کا اپنا ادارہ

النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور۔ ۲۵

اعلیٰ ترین معیار اور وعدے کی پابندی"

ٹیلیفون ۲۷۵۸۲۶

بانیٔ پاکستان کے اصول

وزیرِ اعظم پاکستان، جناب محمد خان جونیجو نے، بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے یومِ ولادت پر بروز جمعہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء کراچی میں مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

"موجودہ حکومت نے بانیٔ پاکستان کے اصولوں پر کاربند رہنے کا عزم کر رکھا ہے"

(خبرنامہ پاکستان ٹیلی ویژن یوم الجمعہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء)

ہم محترم وزیرِ اعظم پاکستان کے اس جرأت مندانہ اعلان پر اُن کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کے نظامِ حکومت کے متعلق جس قدر واضح خاکہ بانیٔ پاکستان کے ذہن میں تھا اور جس کے نمایاں خد و خال، انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں، متعدد بار، اپنی تقاریر میں بیان فرمائے ہیں۔ وہ رہنمایانِ تحریکِ پاکستان اور بعد ازاں، کارپردازانِ حکومتِ پاکستان میں سے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

ایسی ہی اہم اور ناقابلِ تردید حقیقت ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ مملکتِ پاکستان کا استحکام اس کی بقا، اس کی ترقی اور خوشحالی اور اس کے عوام کی فلاح و بہبود، اِس میں اُس نظام کے نفاذ میں ہے جس کے خد و خال، بانیٔ پاکستان نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں۔

ہم محترم وزیرِ اعظم پاکستان کی خدمت میں بصد ادب یہ گذارش کرنا چاہتے ہیں، کہ اگر وہ اپنے اس اعلان میں صدقِ دلی سے کام لے رہے ہیں اور ایسا وہ "سیاسی نعرہ" کے طور پر نہیں کہہ رہے، اور ہمیں ایسا سمجھنے میں کوئی باک نہیں، تو سب سے پہلے اس پر عمل کرنا، ان کے اپنے اختیار میں ہے اور انہیں اس کا عملی ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔

اس غرض کے لئے ہم حضرت قائدِ اعظمؒ کے، پاکستان کے مجوّزہ نظامِ حکومت سے متعلق، سب سے اہم اور واضح بیان کو اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں:-

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی

کا مرجع، خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔"

(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء سے بات چیت اگست ۱۹۴۱ء
بحوالہ "قائداعظم کے تصور کا پاکستان" از محترم غلام احمد پرویز)

اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ، وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے، قائداعظم کے محولہ بالا بیان فرمودہ اصول پر عمل کرتے ہوئے یہ اعلان فرمائیں کہ:-

"مملکت پاکستان کا تمام کاروبار، قرآنی اصول اور احکام کے مطابق ہوگا"

کیونکہ اسی پر عمل پیرا ہونے سے یہ مملکت "اسلامی مملکت" بن سکتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت ان کے حصہ میں آتی ہے یا یہ بھی، اپنے پیش رووں کی طرح اس سے محروم رہ کر، اپنے دورِ اقتدار کے بعد، گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔

ضرورت رشتہ

قرآنی گھرانے سے تعلق رکھنے والی دو بہنوں

جن کی عمریں تیس اور اٹھائیس سال اور تعلیم علی الترتیب بی اے اور انٹر ہے کیلئے مناسب رشتے درکار ہیں۔

خط و کتابت

ڈاکٹر تاج جیلانی، پوسٹ بکس نمبر ۶۹۳۰ ریاض نمبر ۱۱۴۲۱

سعودی عرب

محترمہ ثریا عندلیب

المیزان

ہم نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ قرآن کریم اور انسانی زندگی کا سارا نظم ونسق میزان کے ایک لفظ میں پوشیدہ ہے! میزان جس کا مادہ وزن ہے اور جس کے بنیادی معنی وزن۔ توازن۔ تناسب واعتدال کے ہیں قرآن کریم نے وزن کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ توازن ہی ہے جس پر سارا سلسلہ کائنات چل رہا ہے۔ سیکنڈ کے کروڑویں حصے تک کا حساب ہے جس میں توازن قائم ہوتا ہے۔ اگر مختلف اشیاء کا باہمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے قرآن کہتا ہے: وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۵۵/۷ یعنی خدا نے اس سلسلہ کائنات کو۔ بلندیوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا۔ اب یہ ہمارے غور کرنے کی بات ہے کہ ہم اس توازن کو سمجھ سکیں۔ اس عظیم المثال توازن کی زندہ شہادت تو مختلف فضائی کُرّوں اور اجرامِ فلکی کی باہمی جذب وکشش ہے۔ یہ فضا اور اس میں تیرنے والے بلندیوں کی طرف کرّے اور پستی کی طرف زمین کا کرہ جو گول ہونے کے باوجود پھیلا ہوا ہے اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ بنا دیئے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت کے کل پرزے ہیں۔ اور فرمانِ خداوندی ہے کہ ہم نے زمین میں نہایت عمدہ توازن اور تناسب سے تمام چیزیں اگائیں ۱۵/۱۹ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر شے موزوں یعنی بالکل صحیح توازن لئے پیدا کی گئی ہے۔ یوں کائنات کا سارا نظام عدل کی بنیاد پر استوار ہے اسے قرآن کریم نے صحیح صحیح وزن سے تعبیر کیا ہے اسے میزان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی دنیا میں بھی یہی توازن قائم رہے۔ سورہ رحمٰن میں کہا گیا ہے اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۵۵/۸ یعنی یہ قرآن انسانوں کو اسی غرض کے لئے دیا گیا ہے کہ انسانی معاشرے میں باہمی ربط وضبط کے لئے جس توازن کی ضرورت ہے وہ قرآن کی پیروی کے ذریعے بگڑنے نہ پائے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۵۵/۹ "معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل وانصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو۔ کسی کے حقوق وفرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔" یہ بات ظاہر ہے کہ معاشرہ کا ایسا توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے۔ جو اس توازن کے قیام کا ذمہ دار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم

نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطۂ قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ المیزان بھی نازل کی ہے۔ یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام۔ وہی نظام وہ معیار بنتا ہے۔ جس سے ہر شے کا صحیح صحیح وزن متعین ہوتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۵۷/۲۵ ان آیات بینات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ المیزان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ابدی قوانین کو عملی طور پر متشکل کرنے کے نظام کا نام ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۱۰۱/۶ جس کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۱۰۱/۷ اس کی زندگی اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہو گی وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۱۰۱/۸ اور جس کا سعی و عمل کا پلڑا ہلکا ہوگا فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۱۰۱/۹ وہ ذلت و رسوائی سے دوچار ہوگا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حکیم نے المیزان (قرآنی نظام) کا صحیح نقشہ پیش کر دیا ہے اور یہ وعید بھی دی ہے کہ معاشرہ کے قیام و استحکام کا دارومدار قانونِ خداوندی کے احترام اور نفاذ پر ہے جب اس کے توازن میں فرق آتا ہے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ سورۃ العلق میں بتایا گیا ہے کہ وحی سے بے نیاز ہو کر انسان زندگی کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو وحی کی راہ نمائی سے مستغنی سمجھ کر انفرادی مفاد پرستیوں کا نظام وضع کر لیتا ہے۔ جس میں ہر وہ فرد جو کسی طرح زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دیگر افراد کی ربوبیت کے تصور سے سرکش ہو جاتا ہے وہ میزان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ وحی کا نزول اس لئے ہوا کہ وحی (قرآن کریم) پر ایمان لانے والے تمام انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں اور اسے حسن و توازن کا پیکر بنائیں کہیں بھی اس میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ کبھی اس میں ہیر پھیر نہ کیا جائے۔ خارجی کائنات میں میزان کا یہ عالم ہے کہ ہر شے اپنی اپنی وحی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ مثال کے طور پر چاند سورج جیسے عظیم القدر کرّے دیکھئے۔ کس طرح ایک متعین قاعدے کے مطابق مصروفِ گردش رہتے ہیں وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کیسے نظم و نسق سے سلسلۂ کائنات چل رہا ہے کہیں کوئی فساد نہیں، خلل نہیں۔ سب اشیائے فطرت سجدہ ریز ہیں اس وحی کے سامنے جو ان کو ملی ہے۔ وہ اس نظام کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں جبکہ ہم انسانوں نے ایمان و یقین رکھتے ہوئے اپنے اختیار سے یہ نظام قائم رکھنا ہے۔ اسی سے ہم نے شرفِ انسانیت کو برقرار رکھنا ہے۔ لیکن ہماری حالت بحیثیت قوم کیا نظر آتی ہے! ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے! ہماری میزان کہاں ہے؟ ہم اپنے اختیار کا استحصال کئے جا رہے ہیں! ہمیں اختیار کا شرف اس لئے دیا گیا تھا کہ ہم اس کے صحیح استعمال سے معاشرے میں یعنی عدل و انصاف کا نظام قائم کریں۔ وہ عملی نظام جو تمام افرادِ معاشرہ کے بنیادی حقوق کا ضامن ہو انہیں بد دیانتی اور بے ایمانی سے روکنے کی قوت بھی رکھتا ہو۔ جس میں کسی ایک کے حدود فراموش

اختیار، سے کوئی دوسرا بے اختیار و بے بس نہ ہونے پائے۔ مگر ہم نے کیا تو یہ کیا کہ اپنے اپنے اختیار کو صرف اپنے لئے، اور اپنوں کے لئے مخصوص کر لیا۔ دوسروں کو بھول گئے۔ ہر قدم پر اپنے ہی مفادات کو مقدم رکھا۔ ہمارے اختیار کا یہ استعمال جو عدل و احسان اور حق و انصاف سے کوئی تعلق نہیں رکھتا استحصال نہیں تو اور کیا ہے؟ اس روشِ زندگی سے معاشی میدان میں جو بگاڑ اور معاشرتی امور میں جو فساد برپا ہوتا ہے اس سے ہم بے خبر نہیں۔ ہمارا دن رات اس تلخ حقیقت سے واسطہ رہتا ہے اور قرآن کریم نے ایسا بگاڑ پیدا کرنے والوں کو مُطَفِّفِیْنَ سے تعبیر کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ یعنی مُطَفِّفِیْنَ کے لئے تباہی ہے سورۃ التطفیف کی اس پہلی آیت سے اگلی دو آیتوں میں قرآن نے خود ہی اس کی تشریح کر دی ہے کہ مطففین کون ہیں وہ جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا ناپ کر لیتے ہیں مگر جب دیتے ہیں تو ناپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں۔ کیا ہمارے معاشرہ میں ایسا نہیں ہو رہا؟ اس کج نہادی سے ہی تو ہم ہر شعبۂ حیات میں عدمِ توازن کا شکار ہیں اور میزان کے ترازو میں ہماری ناہمواریوں کا پلڑا بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ اس واضح حکم کے باوجود (جسے ہم پڑھتے رہتے ہیں اور تلاوتِ آیات کو حکمِ خداوندی کی بجا آوری سمجھ رکھا ہے) جو سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۱۷/۳۵ اور جب تم کسی چیز کو ناپو تو ماپ کر پورا کرو اور جب تولو تو ہمیشہ درست ترازو سے تولو ڈنڈی مار لینے سے تھوڑا سا بیجا فائدہ تو ہو جاتا ہے لیکن یاد رکھو حقیقی منفعت ماپ تول کے پورا رکھنے ہی سے ہوتی ہے اور لین دین کی یہی شکل ہے جو مآل کار معاشرہ کے توازن کو قائم رکھ سکتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھیئے کہ تول کا پورا رکھنا صرف دکاندار کے ترازو سے ہی متعلق نہیں ہوتا اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارا پورا معاشی نظام عدل و مساوات کے اصولوں پر استوار ہو۔ نہ کسی سے واجب سے زیادہ لیا جائے نہ کسی کو اس کی محنت سے کم دیا جائے۔ جس معاشرہ میں نظامِ زندگی کا یہ انداز ہو کہ سرمایہ دار اور صاحبِ اقتدار طبقہ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیں بلکہ ان کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں (سرمایہ دارانہ ذہنیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کام کرنے والے کو کم سے کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ رکھا جائے اسی سے سرمایہ داری قائم رہتی ہے) قرآن کریم اسے تطفیف کہتا ہے اور اس نظام کا انجام تباہی اور بربادی بتاتا ہے۔ کیا یہ تنبیہ ہمارے لئے نہیں؟ قرآن قومِ مدین (حضرت شعیبؑ کی قوم) کی مثال پیش کرتا ہے کہ ان کا یہی طریق کار تھا۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۱۱/۸۵ "اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس

...سے تھا یہ اس سرکش قوم نے اپنے پیغمبر کی تنبیہہ کو تمسخر میں اڑا دیا اور اپنے انجام کو پہنچ گئی۔
...کے معنی میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس سے کام کرنے والوں کی صلاحیتیں زنجیروں میں ...جتی ہیں اور کبھی بھی انہیں ابھرنے کا موقع نہیں ملتا وہ سمٹی، سکڑی، بندھی اور ناتمام رہ جاتی ہیں۔ یوں ...میں معاشی ناہمواریوں کے ساتھ انسان کے احترام اور عزت میں کمی کرنا بھی داخل ہے۔ ایسے ...سے معاشرہ کیونکر حسن و توازن کا حامل بن سکتا ہے؟ جب انسانوں کے درمیان انسانوں کو احترام ...ے تو پھر وہاں عدل کہاں سے بار پائیگا۔ چھوٹے بڑے طبقے ضرور وجود میں آتے ہیں اور بے انصافیوں کا ...ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ کہہ کر مظلوموں کو تھپکی دی جاتی ہے ڈھارس بندھانے کے لئے کہ یہ دھاندلیاں ...نے والے آخر کو ایک دن اٹھائے جائیں گے یہ قیامت کو بھولے بیٹھے ہیں۔ گویا یہاں ان کو تا قیامت گردنوں ...ر تکانے چلے جانے کی کھلی چھٹی ہے؟

سوچنے کا مقام ہے کہ آخر اس میزانِ عدل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ سیدھی سی بات ہے کہ انسانی پرورش کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے یعنی مختلف النوع زمینی پیداوار، اناج، سبزیاں، لذیذ پھل خوشوں کے پردوں میں لپٹی ہوئی کھجوریں رنگا رنگ کے خوشبودار پھول پودے اور دیگر نعائم یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے فائدے کیلئے مشترکہ طور پر دیئے ہے۔ ہر فرد کے لئے الگ الگ نہیں رکھا۔ البتہ اس کی تقسیم کے لئے قرآن کی میزان دے دی گئی تاکہ ہر فرد کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق ملتا رہے۔ اگر مشترکہ سامانِ زیست کی تقسیم اور خرچ کے لئے خدا کی طرف سے مستقل اصول و قوانین نہ دئیے جاتے اور اسے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح چاہیں اُسے صرف میں لائیں، تو پھر وہی ہوتا جو اب ان اصول و قوانینِ خداوندی کو طاقِ نسیاں پر رکھ کر دھڑلے سے ہو رہا ہے یعنی جس کے ہاتھ میں طاقت ہے اسے سب کچھ سمیٹ لینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور یہ غلط طاقت بددیانتی اور بے ایمانی سے جنم لیتی ہے اور پھر کوئی جرم جرم نہیں رہتا۔

ہماری اصلاح کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ اپنے معمولات اور معاملاتِ زندگی میں سنجیدگی کے ساتھ اس فرمانِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھا جائے جو سورۃ شوریٰ میں ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ "اللہ نے ...ضابطہ قوانین کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میزان (عملی نظام) کو جس میں ہر ...ل ٹھیک ٹھیک تلتا ہے اور اس کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے" اور اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیۡبٌ ۴۲/۱۷ "تجھے کیا خبر کہ نتائج سامنے آنے کا وقت قریب ہو" مت بھولیے! ...یہ وارننگ ہمارے لئے بھی ہے۔ بلکہ اس دور میں ہمارے ہی لئے ہے۔

رسولوںؑ کی تشریف براری کے بعد

اُمتیوں کا طرزِ عمل!

قرآن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھیں گے کہ:

"تمہارے بعد تمہارے نام لیواؤں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو معبود بنا کر، خدائی کا درجہ دے دیا تھا اور کہتے تھے کہ یہ خود تمہاری تعلیم تھی۔ کیا تم نے ان سے ایسا کہا تھا؟" (۵/۱۱۶)

(مفہوم القرآن صد ۲۸۲)

اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ یہ کہیں گے کہ:-

"تیری ذات اس سے بلند ہے کہ تیرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔ مجھے بھلا یہ کب زیب دیتا تھا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق حاصل نہیں تھا؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تجھ سے کیسے مخفی رہ سکتی تھی؟ یہ تو ہو سکتا ہے (اور امرِ واقعہ بھی یہی ہے) کہ جن باتوں کا علم تو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہے، وہ میرے (یا کسی اور کے) علم میں نہ آسکیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تیرے بندوں کے دل میں جو بات ہو، وہ تجھ سے پوشیدہ رہ جائے؟ تُو تو ہر سربستہ راز، اور مستقبل میں ہونے والے حوادث تک سے واقف ہے" (۵/۱۱۶)

مفہوم القرآن صد ۲۸۲

ایک کتاب ہے A RANKING OF THE 100 MOST INFLUENTIAL PERSONS IN HISTORY جس کے مصنف "Michael H. Hart-" نے حضرت عیسیٰؑ کو ان کے دائرہ اثر و نفوذ کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ (حضور نبی اکرمؐ کا اسمِ گرامی اس فہرست میں سرِاول ہے)۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق (غالباً متذکرہ بالا آیۂ قرآنیہ ہی کی روشنی میں) یہ لکھا ہے:

"IT HAS OFTEN BEEN SAID THAT IF CHRIST WERE TO RETURN TO EARTH, HE WOULD BE SHOCKED AT MANY OF THE THINGS WHICH HAVE BEEN DONE IN HIS NAME AND HORRIFIED AT THE BLOODY FIGHTS BETWEEN DIFFERENT SECTS OF PERSONS WHO CALL THEMSELVES HIS FOLLOWERS. (Page 56)"

"یعنی اگر کہا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں تو انہیں کئی ایسی چیزوں کو جان کر، جواُن کے نام پر کی گئیں، بے حد صدمہ ہوگا۔ اور ان انسانوں کے مختلف دھڑوں کی باہمی خونریز لڑائیوں کی بنا پر جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کہتے ہیں، وہ انتہائی خوفزدہ ہو جائیں گے"۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مائیکل ہارٹ کی اس ۱۰۰ انسانوں کی فہرست کے سرِاوّل، حضور نبی اکرمؐ اگر کبھی اس دنیا میں واپس تشریف لا کر دیکھیں کہ اُن کے اُمتیوں نے اُن کے نام پر کیا کچھ کیا اور کس ارزانی سے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہایا ہے (تاریخ میں بغداد کی گلیوں نے اُمت کا خون بہتے دیکھا ہے اور ہمارے زمانے میں ایران و عراق کے لالہ زار اس کے شاہد ہیں) تو آپ کو کس قدر صدمہ ہو اور آپ اپنے اُمتیوں کے بارے میں کس رائے کا اظہار کریں (کیونکہ کسی جانے والے انسان کا اس دنیا میں واپس آنا ایک ایسا مفروضہ ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے منافی ہے)۔ لیکن اس بات پر تو قرآن کریم بھی شاہد ہے کہ آپ کم از کم خدا سے یہ شکایت تو کریں گے کہ:-

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○

"اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو، (اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے)، اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔" (۲۵/۳۰) (مفہوم القرآن صفحہ ۸۴۲)

اور اس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ، حضور نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کی یہ شکایت کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو مہجور کر رکھا تھا۔ آپ کسی دوسری کتاب (کتبِ احادیث مشمول) کے متعلق (جنہیں حضورؐ کے نام نامی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے)، ایسی شکایت نہیں کریں گے۔

کیا، قرآن کریم کے ساتھ، اپنی خود ساختہ کتابوں کو ملانے والے اور انہیں قرآن جیسی اہمیت دینے والے، اور ان (خارج از قرآن) کتابوں کو بنیاد بنا کر (اللہ تعالیٰ کی واضح تنبیہہ اور ایسا کرنے والوں کی، اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہر قسم کی بے تعلقی کی تندیر (۶/۱۶۰) کے باوجود) مختلف فقہوں اور فرقوں کو ماننے والے (قرآن کریم کی نصِ صریح کی بنا پر اُمت کا فرقوں میں بٹ جانا، شرک ہے اور ایسا کرنے والے مشرکین ۳۰/۳۱-۳۲) اور پھر ان کی بنا پر اُمت کو مختلف دھڑوں میں تقسیم کرکے، اُن میں باہمی سر پھٹول کا مستقل اور دائمی مواد بہم پہنچانے والے اپنی سوچ کا رُخ اس طرف موڑنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ کہ یہ بڑا ہی سوچ کا مقام ہے!

ہیں آج کیوں ذلیل، جو کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

خالد منصور نسیم

کیا اصلاحِ احوال کیلئے تشخیصِ مرض کافی ہے؟

قائمقام وفاقی محتسب جناب جسٹس شفیع الرحمٰن صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے:۔

"لوگ انتظامیہ کی مرضی سے قانون توڑتے ہیں"

(روزنامہ جنگ لاہور، ۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ء)

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ لاقانونیت، کیوں اس سرعت سے اور بلا روک ٹوک، ہماری زندگی کے ہر گوشہ کو اپنی لپیٹ میں لئے جارہی ہے۔

قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا، جس کی تفصیل سورۃ صٓ کی آیات ۲۱ سے ۲۵ میں آئی ہے۔

تو آپ نے مقدمہ سُن کر کہا کہ جو آدمی اپنی ننانوے دنبیوں کے ساتھ غریب بھائی کی ایک دنبی ملانا چاہتا ہے۔ وہ ظلم کر رہا ہے۔ ولیکن جب اس کے بعد آپ نے اس پر غور کیا تو یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آگئی کہ معاملہ صرف اُن دنبیوں کا نہیں۔ یہ اس غلط معاشی نظام کا سوال ہے جس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر، امیر تر، اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے اور دن بدن معاشرہ کے ان دو طبقات میں بُعد زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ اُن کا فریضہ ہے کہ اس غلط معاشی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کریں، یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے ربّ سے سامانِ حفاظت طلب کیا۔ ایسی بلند ہمت جس سے وہ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر سکیں اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی اصلاح کر کے رہیں گے۔

یعنی مرض کی تشخیص، گو علاج کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن صرف تشخیصِ مرض ہی سے علاج پورا نہیں ہو جایا کرتا۔

کیا وفاقی محتسب صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے اس ضمن میں فرمایا ہے، اس سے ان کی ذمہ داری پوری ہو گئی؟

یاد رکھئے! کارپردازانِ حکومت میں سے ہر فرد پر اُن کے منصب کی جہت سے یہ ذمہ داری عاید ہوتی

ہے کہ وہ تشخیص مرض پر ہی اپنے فرائض کی بجا آوری کی انتہا نہ سمجھ لے بلکہ تشخیص کے بعد اُن کی اصل
ذمہ داری، علتِ مرض کا علاج کرنا بن جاتی ہے۔

اگر ہمارے اولیاءِ امور (اولی الامر منکم) دیانت داری سے اپنی زندگیوں کا یہ شعار بنا لیں تو
یہ مملکت اور اس کے ساتھ، اس میں بسنے والوں کی جنتِ ارضی مسکراتی ہوئی ہمارے سامنے آجائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است؟

محمد عمر دراز

قارئینِ طلوعِ اسلام کیلئے

خوشخبری

مندرجہ ذیل نایاب کُتب کے
تازہ ایڈیشن چھپ گئے ہیں

(۱) اقبالؒ اور قرآن جلد اوّل — قیمت ۲۵/- روپے
(جلد دوم زیرِ تدوین ہے)

(۲) جہانِ فردا — ۳۵/- روپے

(۳) لغات القرآن جلد دوم — ۷۵/- روپے
(لغات القرآن کی چار جلدوں کا مکمل سیٹ ۲۷۵/- روپے)

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲، لاہور

محمد اسلام
کراچی

افکارِ پرویزؒ کی صدی

(مسلسل)

(جون، جولائی، اگست ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میرے پاس نہیں ہیں)

ستمبر ۱۹۵۰ء

لمعات اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے مسئلہ کشمیر اور ہندو قوم کی ذہنیت کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

ہندو مائتھالوجی میں یہ سارا سلسلہ کائنات ایک روپ لیلا (تھیٹر کا کھیل) ہے جس میں برہما خود نٹ راجن (سب سے بڑا کھلاڑی) ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کا خدا اس قسم کے کھیل کھیل رہا ہو وہ قوم زندگی کی اسٹیج پر ایسے ہی کھیل کیوں نہ کھیلے۔ اس قسم کا کھیل ہے جو بھارت کی حکومت کی طرف سے پاکستان کے تعلقات کے سلسلہ میں گذشتہ تین سال سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس تھیٹریکل کمپنی کا "مشہور و معروف مایہ ناز کھیل" مسئلہ کشمیر ہے جو پچھلے دنوں سے نئے سین سینریوں کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کشمیر کے مسئلہ کا اصل حل مجاہدینِ کشمیر کی سرفروشیوں کے صدقے آج سے قریب تین سال پہلے ہو ہی چکا تھا کہ ہماری شومئی قسمت سے حالات نے پلٹا کھایا اور حق و انصاف کی جیتی ہوئی بازی ایک رات میں ہار دی گئی جب سرینگر کے ہوائی اڈے کے قریب پہنچے ہوئے مجاہدین پچھلے پاؤں لوٹتے دکھائی دیئے۔ یہ کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ اور اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اس کے متعلق شاید مستقبل کا مورخ ہی کچھ کہہ سکے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ تین سال سے ہمارے سامنے ہے۔ اس تین سال میں قوم کی تمام مساعی اس مسئلہ کی نذر ہو رہی ہے اور اس کے باوجود صورتِ حالات یہ ہے کہ ہم آج وہیں کھڑے ہیں جہاں تین سال پہلے تھے ...

ہر چند دنیا کی کمیائی سیاست میں .... فریب کاریاں اور دوباہ بازیاں ہی اصل تدبر قرار

پڑ چکی ہیں ..... تاہم ہندوستان کی مملکت کے ارباب نظم ونسق نے اس باب میں جن کھلی ہوئی بدعہدیوں اور حدود فراموشیوں کا مظاہرہ کیا ہے، ان پر ان کے استادانِ مغرب بھی انگشت بدنداں رہ گئے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے ہندو کا یہ طرزِ عمل ممکن ہے موجب حیرت اور غیر متوقع ہو لیکن ہمارے نزدیک ان کی کوئی حرکت نہ غیر متوقع ہوتی ہے اور نہ باعث استعجاب۔ قارئین طلوع اسلام، طلوع اسلام کے گذشتہ پرچوں کی ورق گردانی کریں اور دیکھیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی معاملات کے ضمن میں ہندوؤں کے متعلق ہم جو کچھ لکھتے رہے ہیں۔ بعد کے واقعات نے حرفاً حرفاً تصدیق کی ہے یا نہیں۔ اس سے ہمیں اپنی دور بینی اور وقتِ نظر کا اعادہ مقصود نہیں بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جو شخص واقعات وحوادث کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرے گا۔ وہ ان نتائج پر خود بخود پہنچ جائے گا۔ قرآن کی رو سے واقعات اور حوادث یونہی ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتے رہتے بلکہ وہ فطری مظاہرے ہوتے ہیں اس ذہنیت کے جو ان واقعات کے پیدا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ قرآن اسی ذہنیت کے فرق سے انسانوں کو مختلف گروہوں (TYPES) میں تقسیم کرتا ہے۔ مومنین، کفار، فاسقین، مجرمین، ظالمین، مترفین، منافقین، شاعرانہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ وہ اصطلاحات ہیں جن سے قرآن مختلف قسم کی ذہنیتوں کو تعبیر کرتا ہے۔ ایفائے عہد کے لئے انسان کو اپنے آپ کو ان حدود کے اندر رکھنا پڑتا ہے جو حدود معاہدہ کی رو سے متعین ہو چکی ہوں۔ حدود کا احترام یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے زندگی کو ہر شعبے میں حدود کا پابند رہنے کا خوگر بنانا ضروری ہے۔ جو قوم اپنی زندگی کو محکم اصولوں کے تابع نہ رکھے بلکہ ہر موڑ پر وہ راہ اختیار کرے جو اس کے نزدیک فائدہ رساں ہو وہ حدود کے احترام کو پہچان نہیں سکتی۔ آج دنیا کی ساری سیاست اسی قسم کی مصلحت کوشی (EXPEDIENCY) کے تابع چل رہی ہے اور یہی روش ہندوستان کے ارباب سیاست کی ہے۔

باب المراسلات

اس ماہ کے طلوع اسلام میں باب المراسلات کے صفحات میں "قومی ملکیت" کے متعلق ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں طلوع اسلام اس نظریہ کا داعی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلامی معاشرہ کی مکمل شکل اس وقت وجود میں آتی ہے جب زمین اور دیگر ذرائع پیداوار اجتماعی نظام کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور وہ تمام افرادِ مملکت کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اس کے برعکس سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو

پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا، اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے۔ جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائیں تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خریدے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرے کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں"

یعنی ان کے نزدیک اس سے "ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا" ہم حیران ہیں کہ ہم اسے کیا سمجھیں؟ کیا آپ براہِ کرم اس پر روشنی ڈالیں گے؟

سائل کے اس سوال اور مودودی صاحب کی تکنیک کا جواب دیتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا:

ہم نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ مودودی صاحب کے حواریوں میں سے ایک صاحب نے ایک مرتبہ ان کی شان میں یہ فرمایا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتے ہیں۔ لہٰذا جن کی پوزیشن یہ ہو وہ اگر ہر اس نظام اور نظریہ کو جو ان کی مصلحت کوشیوں سے ٹکراتا ہو سب سے بڑا انسانیت کش شیطانی نظام قرار دیں، تو اسے کم اور کیا کہیں۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو الفاظ کے ــــ

دھندے میں الجھائے چلے جاتے ہیں آپ ان کی کتابوں کو دیکھئے کہ جو بات سیدھے سادے طور پر ایک صفحہ میں کہی جا سکتی ہے وہ اس کے متعلق بیسیوں صفحات لکھتے چلے جائیں گے۔ اور پھر بھی بات صاف نہیں ہونے پائے گی، اور ان بیس صفحات میں وہ بڑے بڑے آنکھوں اور ان کی بڑی بڑی تصانیف کا ذکر بار بار کرتے چلے جائیں گے تاکہ تمام نوجوان طبقہ اس سے مرعوب ہو جائے۔ قومی ملکیت کے مسئلہ پر جو کچھ طلوع اسلام میں آیا ہے اس کے متعلق قرآنی دلائل دیئے گئے تھے۔ مودودی صاحب نے اپنے اس فتویٰ میں کسی قرآنی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ باقی رہی ان کی وہ ادیبانہ دلیل جو انہوں نے اس اقتباس میں پیش کی ہے سو وہ تلبیس حق و باطل کی ایک بڑی دلچسپ مثال ہے۔ سوال پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی نظام معاشرت و تمدن میں ذرائع پیداوار مرکزی تحویل میں دیئے جائیں گے یا افراد کے پاس رکھے جائیں گے۔ یہ حقیقت واضح ہے اور خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آ رہی ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی، پرہیزگار، خدا ترس یعنی بہمہ وجوہ خدا اور رسولؐ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے اور وہ حکومت کو علی منہاج نبوت و منہاج خلافت راشدہ قائم کریں گے۔ اب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار کو نظام کی تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے گی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخنداری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں۔

۱۔ پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر حکمران گروہ کے ہاتھوں میں آ جائے گا۔

۲۔ ملت اس حکمران گروہ کی غلام ہو گی۔

۳۔ اس حکمران گروہ کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی جنہیں وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لئے استعمال کر سکیں گے

۴۔ اگر سوداگری، کارخنداری اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت ذبح ہو جائے گی۔

اگر اسلامی نظام حکومت کے ارباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ اگر ان کے ہاتھ میں رزق کے سرچشمے چلے گئے تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے تو فرمائیے کہ ایک فرعونی نظام اور ایک اسلامی نظام

میں پھر فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے تو پھر اس اسلامی نظام میں کیا خوبیاں ہیں جن کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کی ہر کوشش کا نام جہاد رکھا جا رہا ہے؟ اگر اسلامی نظام میں بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کا محکوم بننا ہے اگر اس میں بھی پولیس، فوج عدالت اور قانون سازی کی طاقتوں کو حکمران گروہ کے مفاد کا ہی تحفظ کرنا ہے، اگر ان کو ——— بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بن کر بیٹھ جانا ہے تو پھر موجودہ نظاموں میں کون سی خرابی ہے کہ اس نظام میں نہیں ہوگی۔ پھر یہ اتنا بڑا دھوکا دنیا کو کیوں دیا جا رہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی زبان اور قلم سے غیر شعوری طور پر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اس کے قلبی پس منظر کی صحیح صحیح ترجمانی کر دیتی ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت زمامِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے اور اس کا نام اسلامی نظامِ حکومت کا قیام قرار دیتی ہے چونکہ ان کی اس آرزو کا جذبۂ محرکہ بھی وہی ہے جو دوسرے ہوس پرستوں کا ہوتا ہے، اس لئے ان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقشہ بھی وہی ہوتا ہے جو ہر لیڈروں کی جماعت کا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر مودودی صاحب نے قومی ملکیت کو شیطانی نظام قرار دیا ہے، یعنی بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے اور وہ اس مسئلہ کے خلاف خرابیاں وہ گنا رہے ہیں جن کا موجودہ غیر اسلامی نظامِ حکومت میں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے شام اور عراق اور دیگر مفتوح ممالک کی زمینوں کے متعلق یہ انتظام فرمایا تھا کہ انہیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتاً نظامِ حکومت کرے تو کیا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) شیطان کی ایجاد تھا؟ اور کیا اس نظام سے وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئی تھیں جنہیں مودودی صاحب اس نظام کے خلاف بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں۔؟

اس تصور کے خلاف کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو، مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں ایک عجیب طنزیہ تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک اور فقرہ نکالا ہے "والارض للہ" اور اس پر انہوں نے قیاسات کا ایک پورا کریملن تعمیر کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:۔

اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اُتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ للہ ما فی

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ الارض للہ۔ زمین کی ملی ملکیت کی تائید میں کوئی محکم دلیل بن سکتی ہے یا نہیں، ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں اور اسی قسم کی دوسری آیت کا کوئی مفہوم جب ان کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے۔ تو اسے مردود قرار دے دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی جماعت کے تمام دعاوی کا مدار اس اصولی دعوے پر ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لئے ہے، کسی فرد کو حقِ حکومت حاصل نہیں، اور "خدا کی حکومت" سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو (بقول اُن کے) خدا کی نیابت کے طور پر اس کی منشاء کے مطابق حکومت چلائیں اس دعوی کی بنیاد الحکم للہ (ان الحکم الا للہ) ہے یعنی "حکومت خدا کی ہے" اب ذرا سوچئے کہ مودودی صاحب نے الحکم للہ سے قیاسات کا یہ سارا کریملن اپنے حق میں تعمیر کر لیا کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں پہنچتا بلکہ اس کا حق ملت کو پہنچتا ہے۔ جو منشائے خداوندی کے مطابق حکومت چلائے یعنی ان کے نزدیک الحکم للہ سے یہ قیاس بالکل منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص الارض للہ سے بعینہٖ اس قسم کا مفہوم لے یعنی وہ کہے کہ زمین پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل نہیں، یہ ملت کی ملکیت ہے اور ملت ہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق اس کا انتظام کرے کہ۔۔۔ مودودی صاحب کے نزدیک یہ "من مانی تاویل" بن جاتی ہے۔ یعنی الحکم للہ کی وہی تاویل عین قرآنی ہے اور الارض للہ کی اس قسم کی تاویل من مانی ہے۔ الارض للہ کے خلاف مودودی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ بھی آیا ہے کہ للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے الحکم للہ کے ضمن میں بھی تو قرآن میں یہ آیا ہے کہ ملکوت کل شیئٍ، خدا کے لئے ہے اور ملکوت السمٰوٰتِ والارض اسی کے لئے ہے۔

یعنی مودودی صاحب چونکہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اس لئے الحکم اللہ کی تفسیر اس امر کی تاکید کرتی ہے لیکن چونکہ وہ اپنے حامیوں کی زمینداریاں اور جاگیرداریاں قائم رکھنا چاہتے ہیں اسلئے الارض للہ کی اس قسم کی تفسیر انہیں من مانی دکھائی دیتی ہے۔

یہ ہے نمونہ ان لوگوں کا جو اس طرح نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدانِ سیاست میں آ رہے ہیں۔

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد

ماہ ستمبر ۵۲ء کے طلوعِ اسلام میں لارڈ سر برٹرنڈ رسل اور محترم پرویز صاحب کی ایک مختصر سی ملاقات کی روئداد شائع ہوئی ہے۔ یہ ملاقات معمولی سی ہو گئی اس کی افادیت کے پیش نظر اسے ان اوراق کی

زینت بنا رہا ہوں۔ محترم پرویزؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

برطانیہ کے مشہور مفکر لارڈ سر برٹنڈ رسل پچھلے دنوں آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ پہلے اطلاع ملی کہ وہ واپسی پر کراچی ٹھہریں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کراچی کے راستے سیدھے وطن واپس چلے جائیں گے۔ ۲۵ اگست قریب نو بجے شب ان کا جہاز کراچی پہنچا اور وہ علی الصبح آگے روانہ ہو گئے انہیں دیکھنے (اور اگر موقع ملے تو ان سے کچھ باتیں کرنے) کے شوق میں میں بھی کراچی کے ہوائی مستقر پر پہنچ گیا...... مستقر پر مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں ہمارے اکابرین ملت میں سے کوئی موجود نہ تھا (حکومت کی طرف سے صرف دو جونیئر افسر تھے جو رسمی استقبال کے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے وہاں گئے تھے) اور اس سے بھی کہیں زیادہ افسوس کہ کراچی کے علمی طبقہ میں سے بھی وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ لارڈ رسل کا شمار عصر حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے نتائج فکر سے اتفاق یا اختلاف ایک جداگانہ چیز ہے لیکن ارباب فکر و نظر کی قدر افزائی خود اپنے حسن ذوق اور خلش تجسس کا مظاہرہ ہوتا ہے اور سوچنے والے ذہن انہی باتوں سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کسی قوم کی ذہنی سطح کی بلندی کیا ہے۔ اے کاش ہمیں احساس ہوتا کہ قوموں کی تعمیر میں علم اور فکر کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

ہوائی جہاز کا اتنا لمبا سفر تنومند جوانوں کے بھی سر میں چکر اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ لیکن یہ اڑہتر سال کا بوڑھا مفکر جب جہاز سے اترا ہے تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم سے مکان کے صحن میں آگیا ہو۔ شگفتہ، بشاش اور یکسر حاضر دماغ۔ وہ کڑی کمان کی تیر جیسی چال کے ساتھ مستقر کی عمارت میں اپنی قیام گاہ کی طرف آگیا۔ کمرے میں چند نوجوان (بلکہ بعض جوانی سے بھی کم عمر کے) اخباری رپورٹروں نے ان سے سیاست حاضرہ کے متعلق عام اخباری سوالات پوچھنے شروع کر دیئے جن میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کی موقع شناسی البتہ قابل داد تھی کہ انہوں نے اس مختصر سے وقت میں چند سوالات اور ان کے جوابات ریکارڈ کر لئے جسے بعد میں کراچی اسٹیشن سے نشر کیا گیا۔

چونکہ ایک تو وقت بہت مختصر تھا اور دوسرے اس تقریب میں کوئی نظم و ترتیب نہ تھی اس لئے میرے ذوق کی کما حقہٗ تسکین نہ ہو سکی۔ بایں ہمہ میں نے اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، لپکتے کچھ سوالات پوچھ ہی لئے جن میں سے بعض ریڈیو پاکستان کے متذکرہ صدر ریکارڈ میں آ گئے ہیں چونکہ اس قابل یادگار ہنگامی ملاقات سے تنہا لطف اندوز ہونا بخل سا معلوم ہوتا ہے اس لئے میں ذیل میں بکھرے ہوئے سوالات اور ان کے جوابات کو ایک ترتیب و یکرپیش کرتا ہوں تاکہ قارئین طلوع اسلام بھی اس کی افادیت میں شریک ہو سکیں۔

سوال:۔ کیا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ تنہا عقل کی مدد سے خیر و شر (GOOD & EVIL) کے مسئلہ کو

حل کر سکے؟

جواب:- خیر اور شر کے مسئلہ کا تعلق عقل (INTELLECT) سے نہیں جذبات (FEELING) سے ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عقل اس کا حل پیش کر سکے گی یا نہیں۔

سوال:- لیکن جذبات تو ہر شخص کے انفرادی (INDIVIDUAL) ہوتے ہیں اس لئے خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہو جائے گا کیا آپ کے نزدیک خیرِ محض (ABSOLUTE GOOD) کوئی شے نہیں؟

جواب:- خیرِ محض کوئی شے نہیں۔

سوال:- اس سے مترشح ہوا کہ اخلاقی شعور (MORAL CONSCIOUSNESS) بھی کوئی مطلق (ABSOLUTE) چیز نہیں اور اخلاقیات (ETHICS) سب اضافی (RELATIVE) ہیں۔

جواب:- اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہم بچے کو اس کی چھ برس کی عمر میں سکھا دیتے ہیں۔ وہی اس کا اخلاق (MORALITY) ہوتا ہے اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہیں اور اس کا معیار انسانی عقل۔

سوال:- تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کے نزدیک انسانی عقل کے علاوہ علم (KNOWLEDGE) کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

جواب:- میں کسی اور ذریعہ علم سے واقف نہیں۔

سوال:- کیا آپ کے نزدیک انسانی زندگی اور شعور (LIFE AND CONSCIOUSNESS) کی بنیاد (BASIS) یہی دنیائے محسوسات (THE WORLD OF CONCRETE) ہے یا اس سے ماورٰی؟

جواب:- میں سمجھا نہیں کہ (CONCRETE) سے تمہارا مفہوم کیا ہے۔ اب تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی شے (CONCRETE) ہے ہی نہیں، صرف مدرکات (IDEAS) کا وجود ہے۔

سوال:- دنیائے محسوسات سے میری مراد مادے کی وہ دنیا ہے جس کا علم حواس (PERCEPTION) کے ذریعہ ہوتا ہے۔

جواب:- تو پھر انسانی زندگی کی بنیاد اس سے ماورٰی کچھ نہیں۔

سوال:- ہمارے مفکر علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانی انا (HUMAN EGO) صاحبِ اختیار بھی ہے اور فنا نا آشنا بھی (FREE AND IMMORTAL) کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب:- میں انسانی ایغو کو صاحبِ اختیار تو مانتا ہوں لیکن IMMORTAL نہیں مانتا۔

سوال:- کیا آپ کے ملاحظہ سے علامہ اقبالؒ کے "خطبات" یا ان کی اسرارِ خودی جس کا ترجمہ نکلسن نے کیا ہے گزرے ہیں؟

جواب:- نہیں، میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

جواب:- تو پھر آپ غالباً اقبالؒ کے فلسفہ سے بھی آشنا نہیں ہوں گے؟

جواب:- میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔

سوال:- میں درخواست کروں گا کہ آپ ان کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیں۔ کیونکہ اقبالؒ نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کریم کو قرار دیا ہے اور دنیا کی آبادی کا قریب پانچواں حصہ اس کتاب پر اپنی زندگی کی بنیادیں رکھنے کا مدعی ہے۔

"آخری دو تین باتیں کچھ افراتفری میں ہوئیں لیکن میں نے لارڈ رسل کو ایک رپورٹر کے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ ٹیگور سے واقف ہیں اور گیتا بنجلی ان کی نظر سے گزری ہے۔"

"ایک اور رپورٹر کے اس سوال کے جواب میں، کہ دنیا میں امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ساری دنیا میں ایک حکومت کے قیام سے۔ میں نے اس پر پوچھا کہ اس ایک حکومت کی بنیاد (BASIS) کیا ہو گی۔ کہا کہ ورلڈ فیڈریشن (اقوام عالم کے باہمی وفاق) کے انداز کی حکومت۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی حکومت میں قوموں کا الگ الگ وجود باقی رہے گا اور انسانوں کی یہی غیر فطری تقسیم اقوام کے باہمی تصادم (CONFLICT) کا باعث ہے اس لئے جب علتِ تصادم موجود رہے گی تو امن کی توقع بعید سی بات نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اسے فرض بھی کر لیا جائے کہ اس طرح امن قائم ہو جائے گا۔ تو قیام امن تو محض ایک سلبی خصوصیت (NEGATIVE VIRTUE) ہے ایجابی خوبی (POSITIVE ACHIEVEMENT) انسانیت کی نشوونما اور ارتقاء (DEVELOP-MENT & GROWTH OF HUMANITY) ہے یہ کس طرح سے ہو سکے گا۔

انہوں نے کہا کہ انسانوں کی ترقی مختلف اقوام اپنے اپنے ہاں خود کریں گی۔

وافسوس کہ اس کے بعد سلسلہ کلام ختم ہو گیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔"

اکتوبر ۱۹۵۰ء

لمعات اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے عید الاضحیٰ کے موقع پر گھر گھر قربانی کرنے کی رسم کا قرآن کریم کی روشنی میں تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

"پچھلے سال ایک استفسار کے جواب میں طلوع اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۴۹ء میں قربانی کے متعلق ایک تعریفی نوٹ لکھا گیا تھا اس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۹ء کے پرچہ میں اس میں ایک اور

نقطہ کا اضافہ کیا گیا تھا جو آیۂ مبارکہ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" سے متعلق تھا۔ ان مضامین میں قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہ جو ہم ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر شہر، ہر بستی، ہر محلہ، ہر کوچہ، ہر مکان میں بھیڑ، بکری، دنبہ، گائے ذبح کرتے ہیں اس کے لئے قرآن نے کہیں حکم نہیں دیا۔ اس لئے یہ چیز محض ایک رسمی سی ہے۔ رسمیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بُری بھی لیکن ایک رسم میں اور خدا کے حکم میں بڑا فرق ہے۔ پھر جس رسم کا نتیجہ اس قدر اسراف اور ہلاکتِ نسل ہو، اور قرآن نے اس کا کہیں حکم نہ دیا ہو، اس رسم کا جاری رکھنا ملّت کے لئے جس قدر نقصان کا باعث ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی تصریحات کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۹ء کے پرچہ میں پہلے صفحہ پر یہ بتایا تھا کہ اس رسم سے قوم کو کس قدر مالی نقصان پہنچا ہے امسال چونکہ اس باب میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اس لئے اس کے متعلق کوئی تصریحی مضمون شائع نہ کیا گیا لیکن بطور یاد دہانی ستمبر ۱۹۵۰ء کے پرچہ میں اسی حقیقت کو پھر دہرا دیا گیا جو مالی نقصان کے ضمن میں سالِ گذشتہ شائع کیا گیا تھا۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ۔ تاکہ جس میں زندگی کی کچھ بھی رمق باقی ہو اس سے آگہی حاصل ہو جائے۔ اور اثباتِ حقیقت۔ جیسا کہ توقع تھی قرآن کریم کی اس وضاحت پر مولوی صاحبان اور مولویت زدہ ذہنوں، ہر طرف، سے طلوع اسلام کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسجدوں میں، مجلسوں میں، جلسوں میں، اخباروں میں، رسالوں میں یہ شور مچا دیا گیا کہ لیجیو۔ پکڑیو۔ یہ "بے دین" پرچہ مسلمانوں میں الحاد اور بے دینی پھیلا رہا ہے۔ اسلام کے حکموں کو رسم بتا رہا ہے۔ اور اکنامکس (معاشیات) کے دلائل پر مسلمانوں کو مذہب سے متنفر کر رہا ہے۔ ہم نے ان تمام اعتراضات کو بغور دیکھا جو اس ضمن میں طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف اُٹھائے گئے اور ان دلائل کو بھی اچھی طرح سے پرکھا جو عام گلی کوچوں میں قربانی کی تائید میں پیش کئے گئے۔ ان اعتراضات اور دلائل میں سب کچھ تھا، لیکن اگر ان میں نہیں تھا تو قرآن نہیں تھا۔ جب قرآن نے اپنی دعوت کا آغاز کیا ہے تو اس نے مخالفین سے کہا تھا کہ **ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین**، کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو اس کے لئے کسی ہنگامہ آرائی اور غوغا آرائی کی ضرورت نہیں، نہ ہی ضد اور ہٹ دھرمی کا کوئی مقام۔ بات سیدھی سی ہے۔ "هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ"

حقائق و عبر

۱۔ طلاق بدعت اور اہلحدیث علماء

حال ہی میں سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج نے مسلم خاندانی قوانین کی اُس شق کو قرآن وحدیث کے خلاف قرار دیا ہے۔ جس میں طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے ۹۰ دن کی شرط اور کونسل کے نوٹس کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس پر فرقہ اہلِ حدیث کے ایک گروہ کا ترجمان ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے۔

> ان حالات میں جسٹس تنزیل الرحمٰن کا فیصلہ جراٴت مندانہ ہے اور بارش کا پہلا قطرہ بھی کہ حکومت ہی کی عدالت کے ایک فاضل جج نے اس کی بعض دفعات کو قرآن وحدیث کے خلاف قرار دے دیا ہے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء
>
> اب علم و تحقیق کا یہ راستہ کھل گیا ہے تو علمائے کرام کو چاہیئے کہ وہ مذکورہ عائلی قوانین کی دیگر غیر اسلامی دفعات کو بھی عدالت میں چیلنج کریں۔ یہ راستہ اگرچہ خاصا طویل اور صبر آزما ہے تاہم چونکہ حکومت سیدھے طریقے سے قرآن کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں، اس لئے اس کے بغیر اب کوئی چارہ بھی نظر نہیں آتا۔
>
> (ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث بابت ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ء ص)

ہمارے ہاں لوگ بیٹھے بٹھائے تین طلاقیں دے کر، اپنی بیویوں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے، اسے طلاقِ بدعت کہتے تھے جو فوری طور پر مؤثر بھی جاتی تھی، اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک ایسی طلاق، اسلام سے نفاق کے مترادف تھی اور وہ اس کے بارے میں حنفی علماء سے مناظرے کرتے رہتے تھے۔ خود مودودی صاحب نے اس کے بارے میں فرمایا تھا۔

> "بیک وقت تین طلاقیں دے کر، عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے، علمائے اُمت کے درمیان اس مسئلہ پر جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاقِ مغلظہ کے حکم میں، لیکن اس کے بدعت، اور

معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے، طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔" (حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۵۰)

چنانچہ عائلی قوانین کی دفعہ سات میں طلاق بدعت پر پابندی لگا کر، سورۃ النساء کی آیت ۳۵ کی روشنی میں طلاق کو مؤثر قرار دینے سے پہلے لازمی قرار دیا گیا کہ ثالثی کونسل اس بارے میں اصلاح کی کوشش کرے، اس دفعہ پر عائلی قوانین کے مخالف علماء نے یہ اعتراض کیا تھا۔

"بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے۔ لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے، حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دی گئی ہوں، تو اس سے طلاقِ مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدتِ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد، اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے۔

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۳
شائع کردہ مرکزی تنظیم اسلامی ماڈل ٹاؤن لاہور)

حیرت کی بات ہے کہ علماء اہلِ حدیث طلاقِ بدعت کے حرام ہونے کے بارے میں حنفی علماء سے مناظرے کرتے رہتے تھے۔ حکومت نے اس برائی پر جو پابندی لگائی تو اسے بھی مخالف علماء نے حنفی فقہ کے خلاف قرار دیا۔ اب اس پابندی کو ختم کر کے، دوبارہ حنفی مسلک کے رائج کرنے کو فرقہ اہلِ حدیث کا سب سے بڑا عالمِ دین بڑا جراٰت مندانہ اقدام اور بارش کا پہلا قطرہ قرار دے رہا ہے۔ اہلِ حدیث کا یہ عالمِ دین وفاقی شرعی عدالت کا قانونی مشیر بھی ہے، جب اسے خود اپنے مسلک کا علم نہیں تو اس فرقے کے دوسرے نیم تعلیم یافتہ علماء کا کیا حال ہوگا۔ کیا یہ حضرات اس مسئلہ پر حنفی علماء سے مناظرے، محض فرقہ بندی کو ہوا دینے کے لئے کیا کرتے تھے۔!

۲۔ طلاقِ بدعت کے معاشرے پر اثراتِ بد

اگرچہ عائلی قوانین میں طلاقِ بدعت کو خلافِ قانون قرار دیا جا چکا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض علماء اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، ان کے اس قسم کے فتوؤں سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کے بارے میں ایک تازہ واقعہ ملاحظہ ہو، جو روزنامہ جنگ لاہور کی ۲۴ جنوری کی اشاعت سے

بلا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:۔

پشاور۔ پیر کے روز پشاور میں مجسٹریٹ درجہ اوّل مستان خان وزیر کی عدالت میں ایک شرعی مسئلے "حلالہ" کی وجہ سے اس وقت دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی جب حلالہ کی غرض سے ایک شخص سے چند روز کے لئے عارضی نکاح رچانے والی تسلیمہ نامی ایک خاتون کو اس کے نئے شوہر نے آزاد کرنے سے انکار کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق پشاور کے نواحی گاؤں چمکنی میں عبدالجبار نامی شخص نے بیس برس قبل تسلیمہ نامی خاتون سے شادی کی تھی۔ اس دوران تسلیمہ چار بچوں کی ماں بھی بن گئی۔ کچھ عرصہ قبل دونوں میاں بیوی کی پیار بھری زندگی میں ناچاقی پیدا ہو گئی اور شدتِ جذبات میں آکر شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی۔ لیکن نامدار شوہر کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور دوبارہ اپنی بیوی کو اپنانے کے لئے شہر کے ممتاز علمائے دین سے رابطے قائم کرنا شروع کر دیئے۔ علمائے کرام نے اسے شرعی مسئلہ سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ طلاق ہو جانے کے بعد حلالہ ضروری ہو گیا ہے چنانچہ اس نے گاؤں ہی کے ایک شخص سید گل کو اس مقصد کے لئے راضی کر لیا۔ دونوں میں معاہدہ طے پا گیا کہ چند روز بعد طلاق دے کر تسلیمہ کو آزاد کر دے گا۔ لہٰذا منصوبے کے تحت گاؤں کے ایک مولوی نے تسلیمہ کا نکاح سید گل سے پڑھوا دیا۔ نئے شوہر نے بھی اپنے دوست کے ساتھ کئے گئے وعدے کو بھلا کر بیوی کو خوش و خرم رکھنے کی کوششیں شروع کر دیں چند روز بعد وقتِ مقررہ پر عبدالجبار نے طلاق دینے کا مطالبہ کیا تو سید گل نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کر دیا اور ایک سال تک ٹال مٹول کے ذریعے معاملے کو طول دیتا رہا۔ اپنے دوست کی اس وعدہ خلافی سے دل برداشتہ ہو کر پہلے شوہر عبدالجبار نے سید گل کے خلاف مقامی عدالت میں شرعی قوانین کے تحت استغاثہ دائر کر دیا اور الزام لگایا کہ سید گل اس کی بیوی کو اغوا کر کے اس سے زنا کا مرتکب ہو رہا ہے۔ عدالت نے استغاثہ تحقیقات کے لئے متعلقہ تھانہ کو بھجوا دیا۔ جس پر اصل حقائق سامنے آگئے۔ چنانچہ پولیس نے دونوں دعویداروں کو نقضِ امن کے تحت گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر دیا جہاں عبدالجبار نے بیوی کو طلاق دینے کی تردید کی جب کہ سید گل اور تسلیمہ نے طلاق دینے کی تائید کی اور کہا کہ طلاق کے بعد ہماری شرعی شادی ہوئی ہے اب ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ تسلیمہ نے بھی عبدالجبار کو شوہر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر سید گل نے کہا کہ وہ اوّل تو اپنی بیوی کو آزاد نہیں کرے گا۔ اور اگر مجبوراً اسے ایسا کرنا پڑا تو اسے اس شرط پر طلاق دے کر آزاد کرے گا کہ وہ

دوبارہ اپنے پہلے شوہر سے شادی نہیں کرے گی اور صرف اپنے بچوں کے پاس رہے گی۔

(روزنامہ جنگ لاہور بابت ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء)

ہم نے یہ اقتباس فرقہ اہلِ حدیث کے سب سے زیادہ سنجیدہ ہفت روزہ اخبار "الاعتصام" کی ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے صفحہ ۲ سے نقل کیا ہے۔ "اہلحدیث" کے دوسرے اخبارات نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور ان کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ طلاقِ بدعت خلافِ قرآن و سنت ہے لیکن قارئین مذکورہ بالا حقائق وعبر نمبر ۱ میں دیکھ چکے ہیں کہ فرقہ اہلِ حدیث کا بہت بڑا عالم اور وفاقی شرعی عدالت کا قانونی مشیر، طلاقِ بدعت کے دوبارہ رواج کو بارش کا ایک قطرہ قرار دے رہا ہے!

۳- سستی بہشت

اس عنوان کے تحت، ایک عالم دین محمد سعید الرحمٰن علوی صاحب ہفت روزہ چٹان لاہور کے ۱۲ جنوری کے شمارے میں، اپنا اظہارِ خیال ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اب ہم نے بہشتی دروازہ کا تجسس کیا جو جاہل لوگوں کی کاروبار؟ اختراع ہے۔ یہ دروازہ محرم میں ۵ تاریخ کو کھلتا۔ ایوب مرحوم کے دور میں اوقاف بنا تو اس کے بعد معیاد پانچ دن ہو گئی۔ اب کوئی وزیر یا اس قسم کا آدمی افتتاح کر کے سب سے پہلے "بہشتی" بنتا ہے پھر پانچ دن دھکم پیل رہتی ہے۔ جھگڑے ہوتے ہیں لوگ پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ہیں زخمی ہوتے ہیں لیکن "سستی بہشت" کے چکر میں پاگل بنے رہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے حصولِ جنت کا جو راستہ بتایا اور جس کی تبلیغ آخری نبی و امام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور ان کے بعد شیخ فرید سمیت جملہ صالحین جس کا ذکر کرتے رہے وہ ایمان اور عملِ صالح ہے — لیکن ظاہر ہے کہ یہ کٹھن راستہ ہے عمر بھر کا فسق و فجور، رسہ گیری رشوت خوری، چور بازاری ظلم و الحاد الغرض سب کچھ کر کے پاکپتن کا سفر اور اس دروازہ سے گزرنا جنت کے حصول کا آسان راستہ سمجھ لیا۔ افسوس کہ اس سے پہلے مجاور خاندان اور اب اوقاف نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے کتنا بڑا ظلم ہے۔ حضرت شیخ کی تعلیمات سے کتنی بے خبری ہے اس بندۂ رب نے تلوے میں کانٹوں کے زخم سہہ کر زندگی گزاری۔ پیٹ پر پتھر باندھے اور ایک بلند ٹیلے پر بیٹھ کر ارد گرد کے چور، قزاق اور مردم آزار آبادی کو شرافت و انسانیت کی راہ لگایا۔ وہ گیا تو اس کچے حجرے اور مسجد کے سوا کچھ نہ تھا اب یہ پختہ کمرے ان پر گنبد، اور یہ دروازے کہاں سے آگئے مدعا ہر ہے کہ رسولِ محترم کے مدمقابل

لوگوں نے اور اہلِ کتاب کے عاقبت نااندیش پیروں اور مولویوں نے جس طرح مختلف "تقدس خانے" بنا رکھے تھے اور ان کے سبب ان کا معاشی دھندا چلتا رہا اور بسا اوقات سیاسی چودھراہٹ بھی حاصل ہوتی، اسی طرح اب کچھ لوگوں نے ان صالحین کے نام پر ایسا ہی اودھم مچا رکھا ہے۔ بادشاہوں نے اپنے ظلم و جور کو چھپانے کے لئے گنبد اور مقبرے بنوائے اور سجادگان کی ایک کھیپ وظیفہ و دعاگوئی کے لئے رکھ چھوڑی جو اب تک ملت کا خون جونک کی طرح سوچ رہی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور بابت ۱۴ جنوری ۸۸ء صفحہ ۲۲، ۲۳)

طبقۂ علماء کے ایک فرد کے اظہارِ خیال کے بعد، طلوعِ اسلام کو اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود علماء کا ایک طبقہ جاہل لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے۔

---

۴ - بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

فرقۂ اہلِ حدیث کا ایک ہفت روزہ "المنبر" فیصل آباد سے شائع ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر جناب عبدالرحیم اشرف صاحب ہیں۔ وہ کسی زمانے میں، جماعتِ اسلامی کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے لیکن جب جماعتِ اسلامی نے، عملی سیاست میں، اسلام کو اپنی بازیگری کا نشانہ بنایا، تو وہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کے ہفت روزہ المنبر کے ۹ نومبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شیعہ حضرات کے ان عقائد سے بحث کی گئی ہے جو ان کی نظر میں اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ ان کا نصف اخبار، عربی مضامین کے لئے مختص ہے۔ لیکن اپنے اخبار میں وہ شیعہ عقائد اور عربی زبان سے اپنی جہالت کا بھانڈا، فیصل آباد کے چوراہے (گھنٹہ گھر) میں پھوڑتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلفِ صالحین سے درود شریف کے جو الفاظ منقول ہیں وہ ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن بعض اہلِ تشیع آپؐ کی آل کو بھی نبوت میں شریک سمجھتے ہیں اس لئے انہوں نے اس درود میں "وَآلِہٖ" کا اضافہ بھی کر دیا جو عربی زبان کے قواعد کے مطابق غلط ہے۔ ان قواعد کے مطابق اسمِ ضمیر پر اسمِ ظاہر کا عطف نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنے کے لئے حرفِ جار کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ یعنی عربی قواعد کے مطابق آلِہٖ کے اضافے والا درود یوں ہونا چاہیئے۔

صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلِہٖ وسلم

لیکن جن حضرات نے درود میں آلِہٖ کا اضافہ کیا ہے وہ رسول اللہؐ اور ان کی آل کو ایک ہی ہستی

قرار دیتے ہیں۔
ہمارے علماء حضرات بھی بے خیالی یا کم علمی کی وجہ سے کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیتے رہتے ہیں!

۵- مدیر ماہنامہ منہاج القرآن کا شکریہ

ہم نے طلوعِ اسلام کے دو سابقہ شماروں میں، ماہنامہ منہاج القرآن کے حوالہ سے عرض کیا تھا کہ اُمّتِ مسلمہ میں رسول اللہ کے ساتھ حضرت کا لقب لگانے پر اتفاق ہے۔ چنانچہ اگر حضرت کا لقب علیحدہ بھی بولا جائے تو عام مسلمان اس سے رسول اللہ یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد لیتے ہیں۔ لیکن اس رسالے میں اور بریلوی فرقے کے دوسرے رسالوں میں رسول اللہ کے لئے تو حضرت کا لقب استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس فرقہ کے بانی کے لئے اعلیٰ حضرت کا لقب جس سے غیر مسلموں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید اس فرقے کے بانی کا درجہ رسول اللہ سے بلند ہے۔ ماہنامہ منہاج القرآن، کے مدیر نے ہماری اس گزارش کو درخورِ اعتناء سمجھا اور اس کے فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں اپنے فرقہ کے بانی کے نام کے ساتھ اعلیٰ حضرت، کی بجائے ہر جگہ امام لکھا گیا ہے۔ اس طرح انہوں نے حق بات کو خاموشی سے تسلیم کر لیا ہے۔ جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ تاہم اگر وہ اس بارے میں کچھ وضاحت بھی فرما دیتے تو دوسرے علماء بھی اس غلطی کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچا لیتے۔ والسلامُ علیٰ من اتبع الھدیٰ

۶- اسلامی نظام کے علمبرداروں کے نزدیک بیوی کا مقام

اسلامی نظام کے علمبردار ہفت روزہ ایشیا۔ لاہور کے ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں، ضرورتِ رشتہ کا ایک اشتہار شائع ہوا جو اسلامی نظام کے بارے میں جماعتِ اسلامی کی اصل ذہنیت کا اظہار کرتا ہے۔
پہلے یہ اشتہار ملاحظہ ہو:-

ضرورتِ رشتہ۔ بی اے سی ٹی (مستقل بی ایڈ) عمر ۳۲ سال قوم ارائیں کے لئے لاہور کے قریبی اضلاع سے تعلیم یافتہ مناسب رشتہ درکار ہے ذات پات کی کوئی قید نہیں۔
پہلی بیوی سے علیحدگی بوجہ دائمی مریضہ ہونے کے ہو گئی ہے۔　　(صفحہ ۲۴)

انسانی اخلاق کا تقاضا ہے کہ اگر بیوی بیمار ہو گئی ہے تو اس کا علاج کرایا جائے نہ کہ اسے طلاق دے

کر دوروں کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور خود زندگی کے مزے لوٹنے کے لئے نئی شادی رچا لی جائے
جماعتِ اسلامی نے پچھلے دس سال میں مارشل لاء کی حمایت اور اب اس کی مخالفت میں جو کردار ادا کیا ہے
اس کی جھلک اس اشتہار میں نظر آتی ہے۔ غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں درسِ عبرت ہے۔

۷۔ اطاعتِ رسول فرض ہے

فرقہ اہلِ حدیث کا جو اخبار و رسالہ اٹھا کر دیکھا جائے اس میں ایک مضمون حجیتِ حدیث پر ہوتا ہے اور اس مضمون کی ایک سرخی یہ ہوتی ہے کہ اطاعتِ رسول فرض ہے۔ اس سرخی کے نیچے عام طور پر یہ لکھا ہوتا ہے :-

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکافرین (آل عمران ۳۲)

آپ کہہ دیجئے حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، اگر نہ مانیں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

اس آیت کریمہ میں صراحتاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ جس نے بھی اللہ اور رسول کی اطاعت سے اعراض کیا وہ مسلمان نہیں رہا، ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(ہفت روزہ اہلحدیث لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء صفحہ ۱)

پھر اس مضمون میں بعض اوقات واضح الفاظ میں اور بعض دفعہ اشارۃً پرویز صاحب پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔

ہم طلوعِ اسلام میں متعدد بار ایسی احادیث نقل کر چکے ہیں، جو قرآن مجید کی تعلیمات کے بھی مطابق ہیں اور جدید علمی تحقیق بھی ان کے سچا ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر چکی ہے۔ لیکن چونکہ ان احادیث سے فرقہ اہلِ حدیث کے بہت سے لوگوں کے مالی مفاد پر ضرب پڑتی ہے، اس لئے ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے بلکہ وہ عملاً ان صحیح اور سچی احادیث کا انکار کرتے ہیں، ہمارا اشارہ بٹائی والی احادیث کی طرف ہے جسے رسول اللہ نے اپنی زبانِ مبارک سے سود قرار دیا اور زمانۂ جدید کے مشہور ماہرِ معاشیات لارڈ کینز نے علمی تحقیق کے وسیلے ثابت کیا ہے، کہ زمانۂ قدیم میں بٹائی کا معاملہ ہی سود کی سب سے بڑی قسم تھی سود کو اللہ تعالیٰ نے محاربہ قرار دے کر سب سے سنگین جرم قرار دیا ہے۔ جس کی سزا سولی پر چڑھانا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن فرقہ اہلِ حدیث کے بعض لوگوں کے مفاد پر چونکہ رسول اللہ کی ان سچی احادیث سے ضرب پڑتی ہے، اس لئے وہ ان کا انکار کرتے ہیں، اور اس وقت انہیں یاد نہیں رہتا کہ سچی احادیث کے انکار کرنے والوں کا۔۔۔

ٹھکانا جہنم ہے۔

۸۔ جاگیرداروں کے بارے میں جماعت اسلامی کی نئی قرارداد

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ۸ تا ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ء لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں جماعت اسلامی کی نئی پالیسی وضع کی گئی، جس میں جاگیرداری نظام کے بارے میں یہ قرارداد منظور کی گئی۔

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے ملک کو نجات دلائی جائے اور جن افراد نے اپنی ضرورت سے بہت زائد زمین اور دولت جمع کر لی ہے ان میں سے شریعت کے احکام کے مطابق ایک معقول حصہ لے کر ایک رفاہی فنڈ قائم کیا جائے جسے مستحق افراد کی امداد اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کیلئے صرف کیا جائے۔

سود، قمار، رشوت، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور کسب حرام کے تمام دروازے کلیتہً بند کئے جائیں۔

(ہفت روزہ ایشیا بابت ۳ جنوری ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۹)

اس بارے میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس مقصد کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ کیونکہ جماعت اسلامی نے اپنے لٹریچر سے الماریاں بھر دی ہیں لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے اسلام کا جو مالیاتی نظام ہوگا اس کی کیا شکل ہوگی، بلکہ ان کی تحریروں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاید یہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

جاگیرداری کے بارے میں جماعت اسلامی گرگٹ کی طرح جو رنگ بدلتی رہتی ہے وہ ایک تکلیف دہ داستان ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ پاکستان سے جاگیرداری نظام ختم نہ کر سکے، تو انہیں ایسے پاکستان کی ضرورت نہیں، لیکن قیام پاکستان کے بعد جب اس سلسلے میں [اقدا]م اٹھائے جانے لگے تو امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسے خلاف اسلام قرار دیا، اور اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" تصنیف فرمائی۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسے میانوالی کے ایک نواب، اور ساہیوال کے ایک بہت بڑے زمیندار نے لاکھوں کی تعداد میں شائع کرا کے تقسیم کیا۔

قومی اتحاد کی تحریک کے وقت جو منشور شائع کیا گیا اور جس پر جماعت اسلامی کے امیر کے بھی دستخط تھے۔ زمیندارانہ نظام کو شریعت اسلامی کے خلاف قرار دیا گیا۔ اتحاد کا انتخابی نشان، اسی نسبت سے ہل منتخب کیا گیا اور عوام کو یہ یقین دلایا گیا کہ جب قومی اتحاد کی حکومت قائم ہوگی، تو زمین اسی کی ہوگی جو اس میں ہل

چلائے گا۔ قومی اتحاد کی کامیابی کے بعد، جماعتِ اسلامی حکومت میں شریک ہوگئی، لیکن اس وقت اس کے لیڈروں کو قوم سے کیا ہوا وعدہ بھول گیا، بلکہ اس وقت سے لے کر اب تک انہوں نے اپنے اس وعدے کے بارے میں ایک لفظ تک کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور پھر نئے سرے سے لوگوں کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا ہے۔

اس قرارداد میں، انہوں نے قمار کو بند کرانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمارے ملک میں جوئے کا سب سے بڑا اڈا، گھوڑ دوڑ کلب ہے جہاں باقاعدگی سے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کا جوا کھیلا جاتا ہے، لیکن جماعتِ اسلامی کے لیڈر جو چھوٹے چھوٹے معاملات پر، اخباری بیانات جاری کرتے رہتے ہیں، انہوں نے یا دوسرے علماء نے کبھی اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا۔

۹۔ خلافِ مزاج احادیث کا انکار

فرقہ اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام لاہور سے کسی قاری نے دم کرانے اور گنڈے تعویذ کی شرعی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا ہے، جس کے بارے میں رسالے کے مفتی نے یہ فتویٰ جاری کیا ہے۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف دم کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ دم پر اکتفا کیا جائے تاہم جو علماء بطورِ علاج قرآنی تعویذ گنڈے کرتے ہیں، انہیں مشرک قرار دینا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کرنا صحیح نہیں۔"

(ہفت روزہ الاعتصام بابت ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء صفحہ ۱)

اس موضوع پر متعدد احادیث ہیں، جن کے مطابق رسول اللہؐ نے ان دونوں افعال کو شرک قرار دیا، ایک حدیث کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ دم کرنا اور گنڈے تعویذ شرک ہیں۔ یہ حدیث مسند احمد، سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں بیان ہوئی ہے ہم نے یہ حدیث علامہ شوکانی کی کتاب نیل الاوطار، جلد ۹ صفحہ ۱۳۱ سے نقل کی ہے۔ علامہ موصوف اگلے صفحہ پر اس حدیث کے بارے میں تصریح کرتے ہیں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، لیکن چونکہ گنڈے تعویذ، مولوی حضرات کی کمائی کا ایک ذریعہ بن چکے ہیں اس لئے وہ ان صحیح احادیث کو نہیں مانتے۔ اب اس لُوٹ میں اہلِ حدیث علماء بھی شامل ہو گئے اور انہیں اپنا وہ قول یاد نہیں رہا کہ صحیح احادیث کے انکار کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا۔

حُسنِ تحریر

قارئینِ گرامی قدر، سلام و رحمت!
اس سلسلہ کی گذشتہ قسط میں حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے اس گوشے کی پہلی کڑی وجہِ فروغِ دیدہ وقلب بن چکی ہے جسے سلسلۂ غزوات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
اس قسط میں اسی سلسلہ کی دوسری اور تیسری کڑیاں یعنی جنگِ اُحد اور جنگِ احزاب سے متعلق محترم پرویز صاحب کی تحریر آپ کے پیشِ نظر ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کریم سے رہنمائی لینے والے قلبِ سلیم کی رعنائیِ بیان!

محمد عمر دراز

جنگِ اُحُد

(۱۴ شوال ۳ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۲۵ء)

بدر کی شکست نے قریش کی آتشِ خاموش کو شعلۂ جوّالہ میں بدل دیا۔ جن کے اقربا مارے گئے تھے، انکے سینے جوشِ انتقام سے جہنم زار بن گئے۔ وہ سب مل کر ابوسفیان کے پاس گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ شام کے قافلہ کے سامانِ تجارت میں سے راس المال تو حصہ داروں کو واپس دے دیا جائے لیکن زرِ منافع مقتولینِ بدر کے انتقام کے لیے الگ رکھ لیا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، اپنے قومی شاعروں کو ملک کے طول و عرض میں بھیجا کہ وہ اپنی آتش نوائیوں سے ساری فضا کو مشتعل کر دیں، بدر کی لڑائی میں عورتیں ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اس مرتبہ بڑے بڑے اُونچے گھرانوں کی عورتیں بھی فوج کی معیت میں تیار ہو گئیں تاکہ میدانِ جنگ میں مردوں کو غیرت دلائیں اور ان کے پاؤں اکھڑنے نہ دیں۔ اس ساز و سامان اور شکوہ و سطوت کے ساتھ باطل کا یہ سیلاب ۳ شوال ۳ھ میں مدینہ کی طرف امنڈا۔ حضورؐ نے اطلاع پاتے ہی صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ اکابر صحابہؓ کی رائے تھی کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود شہر کے اندر پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن نوجوانانِ ملت کے شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا کہ

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انہوں نے اصرار کیا کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے؛ ان کے اصرار پر حضورؐ نے بھی باہر نکل کر لڑنا منظور کر لیا۔ قریش کا لشکر مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر کوہِ احد کے قریب آ چکا تھا۔ حضورؐ ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ باہر نکلے جن میں عبداللہ بن ابی کی تین سو کی جماعت بھی تھی جو بنو سلمیٰ اور بنو حارث کے قبائل پر مشتمل تھی یہ رئیس المنافقین یہ کہہ کر راستہ سے اپنی جماعت سمیت واپس لوٹ آیا کہ چونکہ محمدؐ نے میری بات نہیں مانی اس لیے میں ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ اب حضورؐ کے ساتھ سات سو کی جماعت رہ گئی۔ ان میں کمسن بچوں کو واپس کر دیا گیا۔ بدر کی طرح یہاں بھی

شوقِ شہادت

بچوں کا شوقِ شہادت اس فیصلہ کے نفاذِ کلی میں عنان گیر ہو گیا۔ جب رافع بن خدیج سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو، واپس چلے جاؤ تو وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد بڑا نظر آئے۔ انہیں اذنِ معیت دی گئی تو ایک اور نوجوان (سمرۃ) جو ان کے ہم سن تھے مُصر ہو گئے، اور انہوں نے یہ دلیل دی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں۔ اگر انہیں اجازت دی گئی ہے تو مجھے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو زمین پر گرا دیا۔ اس بنا پر انہیں بھی اجازت دے دی گئی حضورؐ نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صفیں قائم کیں، پشت کی طرف سے دشمن کی یورش کا خطرہ تھا۔ آپؐ نے تیر اندازوں کا دستہ اس طرف متعین فرمایا۔ اور تاکید فرما دی کہ کچھ بھی ہو وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔

جنگ شروع ہوئی۔ اگرچہ مقابلہ میں تین ہزار کا لشکر تھا۔ جس میں قریب دو سو سوار بھی تھے۔ لیکن یہ جمعیت بھی مجاہدین کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی؟ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے

فتح مبدل بہ شکست

لیکن عین اس وقت ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اس فتح کو مبدل بہ شکست کر دیا۔ تیر اندازوں کا وہ دستہ جو پشت پر حفاظت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ ضبط نہ کر سکا اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں آ گیا۔ ان کے سپہ سالار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے بہت روکا۔ لیکن وہ نہ رُکے۔ ان کے ساتھ صرف چند جانباز رہ گئے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مجاہدین میدان میں بے خطر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے، دیکھا تو سر پر تلواریں برس رہی ہیں۔ ایسی پریشانی پھیلی کہ اپنے بیگانے کی خبر نہ رہی، حضرت مصعب بن عمیرؓ جو رسول اللہؐ سے صورت میں مشابہ تھے شہید ہو گئے تو غل مچ گیا کہ رسول اللہؐ نے شہادت پا لی ہے۔ اس سے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اس اضطراب اور بدحواسی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خود رسول اللہؐ کہاں ہیں؟ عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا کسی طرح حضورؐ کے قریب آ گیا، اور چہرہ مبارک پر تلوار ماری، جس سے مغفر کی دو کڑیاں چہرہ میں چبھ کر رہ گئیں۔ اتنے میں شمعِ نبوت کے پروانوں نے حضورؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ نیزوں اور تلواروں

نہ بوچھاڑ ہو رہی تھی لیکن یہ جاں نثاران، سب کو اپنے سینوں پر لے رہے تھے تاکہ حضورؐ ان کی زد سے محفوظ رہیں۔ مخالفین یہ کچھ کر رہے تھے اور ادھر حضورؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِی فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (کہ اے خدا میری قوم کو معاف کر دے کہ وہ جانتے نہیں ہیں) حضورؐ تیر وسنان کی اس بارش کے باوجود ثابت قدمی سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے جہاں دشمنوں کی رسائی نہ تھی۔ ابوسفیان خوش تھا کہ رسول اللہؐ نے شہادت پالی ہے۔ اس نے مقابل کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ

اُعْلُ هُبَل ـــــ ہبل کا بول بالا ہو۔

صحابہؓ نے حضورؐ کے حکم سے جواب دیا کہ

اَللّٰهُ اَعْلٰی وَاَجَلّ ـــــ بلند و بالا تو اللہ کا بول ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ

لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَكُمْ ـــــ ہمارے پاس عزیٰ دیوتا ہے تمہارے پاس نہیں۔

صحابہ نے کہا کہ

اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَكُمْ ـــــ خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں ہے۔[1]

قرآنی تفاصیل ابوسفیان کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ شہید نہیں ہوئے زندہ ہیں تو اپنی فوج سمیت واپس چلا گیا۔ قرآن کریم نے واقعۂ اُحد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ .... وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۱۵۲)

اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت پورا کر دکھایا تھا جبکہ تم اس کے حکم سے دشمنوں کو تہ تیغ کر رہے تھے (اور ہر طرح جیت تمہاری تھی) لیکن جب ہم نے تمہیں فتح مندی کا جلوہ دکھایا، جو تمہیں اس قدر محبوب ہے، تو تم نے کمزوری دکھائی، اور جنگ کے بارے میں باہم دگر جھگڑنے لگے۔ (ایک گروہ نے کہا اب مورچے پر ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے نے کہا نہیں، ہم تو آخر تک نہیں ہٹیں گے۔) اور بالآخر اپنے کمانڈر کے حکم سے نافرمانی کر بیٹھے، تم میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو مفادِ عاجلہ کے خواہش مند تھے۔ (یعنی مالِ غنیمت کے پیچھے پڑ گئے) لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی نظر مستقبل پر تھی۔ (یعنی مالِ غنیمت سے بے پروا ہو کر، اپنی جگہ پر جمے رہے اور شہید ہوئے) یوں تمہارا رُخ دشمن کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی۔ اور اس طرح تمہاری حقیقت واشگاف ہو گئی (اور اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور پھر

[1] بحوالہ بخاری

اپنے مقام پر واپس آ گئے، تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی اور اس طرح تمہاری لغزش کے آثار مٹ گئے۔
اللہ کا قانون یہی ہے کہ ایک بار کی لغزش سے انسان ہمیشہ کے لیے کامرانیوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔
وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آجائے، خدائی نوازشات سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔
یہ دو جماعتیں تیر اندازوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ وہ جو اپنے امیر کے حکم کے خلاف مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرا
وہ جو اس کے ساتھ اپنی جگہ پر جما رہا۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا
بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۳/۱۵۳)

تم میدانِ جنگ سے بھاگے جا رہے تھے۔ اور (بعد حواسی کا یہ حال تھا کہ) ایک دوسرے کی طرف
مڑ کر دیکھتا تک نہ تھا، اور اللہ کا رسول تھا کہ پیچھے سے پکار رہا تھا، یوں تمہیں نقصان پر نقصان ہوا۔
اس سے مقصد یہ تھا کہ تم آئندہ کے لیے نصیحت پکڑو کہ اپنے مقام سے از خود کبھی نہیں ہلنا چاہیئے
اگر تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی چیز تمہارے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے تو اس کے پیچھے لپک نہ پڑو۔ یا
اگر کوئی سخت مصیبت آ رہی ہے تو اس سے گھبرا کر اپنا مقام نہ چھوڑ دو۔ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ
تم کیا کر رہے ہو۔

پھر جب نبی اکرمؐ امن و حفاظت سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور ابو سفیان کا لشکر واپس لوٹ گیا تو مسلمانوں کو اطمینان
نصیب ہوا اب جو حالات پر تبصرہ شروع ہوا تو ایسے کمزور دل لوگ بھی تھے جو اسے طرح طرح کے ظنون و اوہام پر
محمول کرتے تھے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیات (۱۵۵ سے [illegible] تک) میں ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان
کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں کہ آئندہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔

خواتین کی شرکت

اس جنگ میں کئی ایک خواتینِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق
روایت ہے کہ آپ مشکیں بھر کر لاتیں تھیں۔ اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، حضرت
اُمِّ عمارہؓ کے متعلق منقول ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو دشمنوں نے نرغے میں لے لیا تو آپ نے سپر بن کر حضورؐ کو اپنی
اوٹ میں لے لیا، اور تیروں کی بوچھاڑ کو اپنے آپ پر روکنے لگیں، جب ابنِ قمیہ حضورؐ کے قریب آیا تو اُمِّ عمارہؓ نے
تلوار سے اس پر وار کیا۔ وہ چونکہ زرہ پوش تھا اس لیے وار سے بچ گیا، لیکن اس کی تلوار سے ان کے کندھے پر
گہرا زخم آگیا۔ جب نبی اکرمؐ کی شہادت کی (غلط) خبر مدینہ پہنچی تو خواتینِ اسلام بے تابانہ گھروں سے نکل آئیں اور
میدان کی طرف چل پڑیں، حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے آکر دیکھا تو حضورؐ کے چہرہ مبارک سے جو مغفر کی کڑیوں سے
زخمی ہو گیا تھا ابھی تک خون جاری تھا، حضرت علیؓ اور آپ نے مل کر زخموں کو دھویا۔

دوسری طرف غیر مسلم خواتین کا یہ حال تھا کہ جب حضرت حمزہؓ کو وحشی غلام نے شہید کیا تو ابو سفیان کی بیوی ہند نے ان کی لاش کا مثلہ کیا اور کلیجہ نکال کر کچا چبا گئی۔ اس سے ان لوگوں کی خوئے درندگی کا اندازہ لگائیے!

حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ شکست کی خبر سن کر میدان میں آئیں۔ حضورؐ نے اس خیال سے انہیں لاش دیکھنے سے روک دیا کہ مبادا بھائی کی لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں۔ انہوں نے حضورؐ کا پیغام سنا تو کہا کہ کوئی بات نہیں، میں بھائی کے متعلق سب ماجرا سن چکی ہوں، یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی تو آپ لاش پر گئیں۔ جان سے پیارے بھائی کے ٹکڑے خاک و خون میں آغشتہ سامنے پڑے تھے، مغفرت کی دعا مانگی، اور ضبط کی ایک دنیا آنکھوں میں لیے خاموش واپس آ گئیں۔

اس لڑائی میں مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی شہید ہوئے، مسلمانوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کے کفن کے لیے پورا کپڑا تک بھی نہ تھا، چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے سر کو کپڑے سے ڈھانپا گیا اور پاؤں کو گھاس سے۔ دو دو شہیدوں کو ملا کر ایک ایک قبر میں دفنایا گیا۔ جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا اسے مقدم کیا جاتا۔

ایک صاحب عمرو بن ثابت جو اصیرم کے نام سے مشہور تھے، مسلمانوں کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آیا کرتے تھے لیکن اسلام نہیں لائے تھے، غزوۂ احد کے دن ان کے دل میں صداقت نے جوش مارا، مسلمان ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر کسی کو خبر کئے بغیر سیدھے میدان میں جا پہنچے۔ جانفروشانہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ انہی کے متعلق بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اصیرم نے ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی۔ لیکن سیدھا جنت میں چلا گیا۔

معراجِ شہادت

عشق کی اک جست نے طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھتا تھا میں

دوسری طرف یہ واقعہ بھی قابلِ غور ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا قزمان نامی۔ اس کی مذموم حرکات اس قدر واضح تھیں کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ غزوۂ احد کے دن اس نے کفارِ قریش کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اکیلے سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ صحابہؓ اس کی بہادری پر بہت خوش تھے اور حیران تھے کہ ایسے شخص کے متعلق مخبرِ صادقؐ نے کیسے فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ وہ زخمی ہوا تو صحابہؓ اس کے پاس گئے

محض قومیت و حمیت کا جذبہ

اور اس سے کہا کہ قزمان! ہم تجھے بشارت دیتے ہیں، تو نے بہت بڑا کام کیا۔ اس نے کہا کہ بشارت کاہے کی! یہ تو مکہ اور مدینہ والوں کی جنگ تھی۔ قومی حمیت نے ابھارا اور میں میدان میں آ گیا، یہ نہ ہوتا تو میں کبھی نہ لڑتا۔ اب صحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے مقابلہ میں رہتے ہوئے۔

جان دے دینے کے باوجود مرنے والا کس طرح جہنمی کا جہنمی رہتا ہے۔ شہادت اسی وقت ہے جب جذبۂ فکرِ حق کی مدافعت لیے ہو۔

جنگِ احزاب

ذیقعدہ ۵ھ

میدانِ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے مخالف عناصر کے حوصلے فی الجملہ پست کر دیئے تھے لیکن انہیں اُحد میں دوبارہ شکست ہوئی تو اس نے راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دے دی اور مخالفت وعداوت کے جذبات میں از سرِ نو سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ اب ان فتنہ پردازیوں کا سب سے بڑا مرکز خود مدینہ تھا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ نبی اکرمؐ نے ان سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ لیکن ان

مدینہ کے یہود

میں مدت ہائے دراز کی بے مرکزی اور غلامی سے دنائیت اور سفاہت کی ایسی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے انہیں عہد و معاہدہ کا کوئی پاس ہی نہ تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ یہ لوگ قریش کی طرح کھلی ہوئی دشمنی نہیں کرتے تھے بلکہ مارِ آستین بن کر ڈستے تھے۔ منافقت سے مسلمان ہو جاتے اور اس طرح ان کی جماعت میں داخل ہو کر تخریبی سازشیں کرتے۔ یہ سب سے بڑا فتنہ تھا جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے سینہ کا ناسور بن گیا تھا۔ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ اہلِ کتاب و منافقین کی اسلام برانداز سازشوں اور انسانیت کش و انسانیت سوز وسیسہ کاریوں کی اجمالی اور تفصیلی داستانیں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ ان تفاصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ مومنین کی قوتوں کا بڑا حصہ اسی فتنہ کے استیصال کی نذر ہو گیا۔ منافقین کی یہ روباہ بازیاں ان کے اپنے دائرہ سے نکل کر عربی قبائل کو بھی متاثر کر گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بھی بدعہدی اور غداری شروع کر دی۔ ۴ھ کا ذکر ہے کہ قبیلۂ کلاب کے رئیس ابوالبراء نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ چند مبلغین کو اس کے ساتھ بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس کے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضورؐ نے ستر انصار اس کے ساتھ کر دیئے۔ انہوں نے اپنے نمائندہ حرامؓ

مسلم مبلغین کی شہادت

بن ملحان کو اس قبیلہ کے دوسرے سردار عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ عامر نے حرامؓ کو قتل کر دیا اور خود آس پاس کے قبائل کے

فٹ نوٹ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ فرمائیں

ساتھ ایک لشکر لے کر آگے بڑھا۔ اور تمام صحابہؓ کو نرغے میں لے کر شہید کر دیا۔ صرف ایک (عمرو بن امیہ) کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔ اس واقعۂ فاجعہ [illegible] سے حضورؐ اور صحابہ کبارؓ کے دل پر جو قیامت گذری ہوگی اس کا اندازہ ہر قلبِ مومن لگا سکتا ہے۔ اسی طرح عضل اور قارہ کے دو قبیلوں کے چند آدمیوں نے آکر کہا کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے چند آدمیوں کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ وہ انہیں اسلام کے احکام سکھا دیں، آپ نے حضرت عاصم بن ثابتؓ کی سیادت میں دس صحابہ کو ساتھ کر دیا۔ راستہ میں ان بدبختوں نے غداری کی اور بنو لحیان کے دو سو آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ انہیں

کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے

قتل کر دو۔ صحابہؓ یہ بھانپ کر ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ تیراندازوں نے کہا کہ تم نیچے اتر آؤ ہم تمہیں پناہ دیں گے لیکن حضرت عاصمؓ نے کہا کہ ہم کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے۔ سات مجاہد تو وہیں شہید ہو گئے اور تین کو یہ قیدی بنا کر ساتھ لے گئے ایک کو راستہ میں شہید کر دیا۔ اور باقی دو (حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ) کو اہلِ مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ انہیں اس کے دو لڑکوں نے خرید لیا کہ باپ کے بدلے میں قتل کریں گے۔ ایک دن یہ انہی کے گھر میں حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے۔ بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی اور دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے۔ یہ دیکھ کر کانپ اٹھی۔ حضرت خبیبؓ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ہم بچوں کو قتل نہیں کیا کرتے۔ حارث کے بیٹے انہیں باہر لے گئے اور انہیں قتل کرنا چاہا۔

قابلِ رشک شہادت

آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دے دی انہوں نے نماز پڑھ کر کہا کہ جی تو چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھتا رہوں لیکن اس سے شاید تمہیں خیال گذرتا کہ میں موت سے ڈرتا ہوں، اس لئے نماز ختم کرتا ہوں۔ اللہ اکبر! عین تلوار کے نیچے گردن رکھ کر اس قدر طمانیتِ قلب صرف ایمانِ محکم سے ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ اسی زمانہ سے یہ دستور ہو گیا ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہے۔ حضرت زیدؓ کو قتل کرنے لگے تو ابوسفیان نے (جو تماشائیوں کے ہجوم میں کھڑا تھا) کہا کہ سچ بتلاؤ اگر اس وقت تمہارے بدلے محمدؐ قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوشی نہ سمجھتے! انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ او بدبخت! کیا کہتا ہے! میں تو اپنی جان کو اتنا بھی عزیز نہیں رکھتا کہ اس کے عوض رسول اللہؐ کے کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہ تھا قرآنی تعلیم کا اثر!

اب خود یہود کی طرف آئیے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کے تین قبیلے (بنو قینقاع۔ نضیر۔ اور قریظہ)

مدینہ میں سکے باشندں سے حضورؐ نے معاہدۂ امن و اتحاد کیا تھا۔ اس معاہدہ کو سب سے پہلے قینقاع نے توڑا۔

یہود کی عہد شکنی

اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا محاصرہ کیا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد وہ تنگ آ گئے۔ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو ثالث کیا جس کے فیصلے کے مطابق انہیں مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا۔ بنو نضیر کی طرف سے بھی نقضِ عہد کے آثار و قرائن پے در پے ظہور میں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے حضورؐ کی جان تک پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ آپ نے ان سے تجدیدِ عہد کے لئے کہا۔ لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں اپنے قلعوں پر ناز تھا اور منافقین در پردہ ان کی حمایت پر تلے بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے ان کا بھی محاصرہ کیا اور درختوں کے وہ جھنڈ جن سے وہ کمین گاہوں کا کام لیتے تھے کٹوا دیئے۔ پندرہ دن کے بعد انہوں نے بھی امان چاہی تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنا مال و متاع لے کر مدینہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر خیبر کی طرف چلے گئے۔ سورۂ حشر کی ابتدائی پندرہ آیات میں انہی یہودیوں اور ان کے خفیہ مددگاروں (منافقوں) کا ذکر ہے۔

جنگِ احزاب تک پہنچنے کے لیے ان تمہیدی تفاصیل کو سامنے لانا ضروری تھا۔ قریش اور یہود کی اس متفقہ سازش نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی۔ بنو نضیر نے خیبر پہنچنے کے بعد قریشِ مکہ کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ وہ پہلے ہی سے آمادہ بیٹھے تھے۔ پھر یہ قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے، اور انہیں بھی جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔ قبیلہ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق کی بنا پر وہ بھی شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ بنو سعد کا

جنگِ احزاب

قبیلہ یہود کا حلیف تھا وہ بھی آمادہ ہو گیا چنانچہ یہ تمام طاغوتی قوتیں اپنے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر حق کے مقابلہ کے لیے یکجا ہو گئیں کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ۔ اسی جہت سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی مختلف جماعتوں کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ۔ یہ لشکرِ جرار آندھی کی طرح اٹھا اور مدینہ کے مضافات تک آ پہنچا۔ بنی قریظہ کے یہود جنہوں نے مسلمانوں سے عہد کیا تھا، ابھی تک الگ تھے۔ لیکن بنی نضیر کی ترغیب سے یہ بھی مخالفین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور اب کفار اور یہود کی پوری قوتیں حق کے مقابلہ میں آ گئیں۔ تصادم و تزاحم کا یہی وہ ہجوم تھا جس کی تصویر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ○ (۳۳/۱۰-۱۱)

والے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو! جب وہ لوگ (یہود و کفار) تم پر اوپر اور نیچے ہر طرف سے (نرغہ کرکے) آچڑھے تھے اور دہشت کے مارے تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور حالت یہ تھی کہ (کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا) اور جو تم میں سے کمزور تھے، ان کے دل میں اللہ کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعتِ مومنین نے بتا دیا کہ ان میں کس قدر قوتِ ایمان پیدا ہو چکی ہے۔ (انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا) حالانکہ وہ بری طرح جھنجوڑ ڈالے گئے تھے۔

خندق کی تیاری

نبی اکرمؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سے یہ طے پایا کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود ایک خندق کے اندر پناہ گزیں ہو کر مدافعت کریں۔ چنانچہ ایک بہت بڑی خندق کھودی گئی۔ اللہ کے ان "مزدوروں" میں خود حضورؐ بھی شامل تھے یہ تھی جماعتِ مومنین کی وہ سپاہیانہ زندگی جس سے باطل کی ہر قوت پر غلبہ حاصل ہونا تھا۔ یہ معرکہ بڑی ہمت اور استقامت کا متقاضی تھا۔ دن رات کی مشقت، بھوک اور خوف کی صعوبت۔ سامنے ایک جمِ غفیر سمندر کی طرح متلاطم۔ مسلمانوں کی فوج میں منافقین بھی موجود تھے۔ لیکن منافقت و ایمانِ خالص کی تو پرکھ ہی جاں گداز مراحل میں ہوتی ہے۔ وہ لگے بہانہ سازیاں اور روباہ بازیاں کرنے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۭ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ڔ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ (۱۲، ۱۳)

اور (یاد کرو) جب وہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ اور نفاق کا مرض تھا۔ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے جھوٹا وعدہ کیا ہے! اور جب ان منافقین کے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب (مدینہ) والو! تمہارے لئے یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں سو (اپنے گھروں کو لوٹ چلو، اور ان میں سے بعض لوگ رسول اللہ سے (گھر جانے کی) اجازت مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ (چونکہ) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں۔ (اس لیے ہمیں واپسی کی اجازت دیجئے۔ اُن کے گھر (قطعاً) غیر محفوظ نہیں ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ (ان بہانوں سے) بھاگنا چاہتے ہیں۔

یہ تمام حیلہ جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ ان کے قلبی رجحانات کفر کی طرف تھے، اگر انہیں ان ہی حالات میں مسلمانوں سے لڑنا پڑتا تو سب سے آگے ہوتے۔ سورہ احزاب کی آیات (۱۳ تا ۲۰) میں انہی منافقین

مدینہ میں تھے، جن سے حضورؐ نے معاہدۂ امن واتحاد کیا تھا۔ اس معاہدہ کو سب سے پہلے قینقاع نے توڑا۔

یہود کی عہد شکنی

اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا محاصرہ کیا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد وہ تنگ آ گئے۔ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو ثالث کیا جس کے فیصلے کے مطابق انہیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ بنو نضیر کی طرف سے بھی نقضِ عہد کے آثار و قرائن پے درپے ظہور میں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے حضورؐ کی جان تک پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ آپ نے ان سے تجدیدِ عہد کے لئے کہا۔ لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں اپنے قلعوں پر ناز تھا اور منافقین درپردہ ان کی حمایت پر تلے بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے ان کا بھی محاصرہ کیا اور درختوں کے وہ جھنڈ جن سے وہ کمین گاہوں کا کام لیتے تھے کٹوا دیئے۔ پندرہ دن کے بعد انہوں نے بھی امان چاہی تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنا مال و متاع لے کر مدینہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر خیبر کی طرف چلے گئے۔ سورۂ حشر کی ابتدائی پندرہ آیات میں انہی یہودیوں اور ان کے خفیہ مددگار، (منافقوں) کا ذکر ہے۔

جنگِ احزاب تک پہنچنے کے لیے ان تمہیدی تفاصیل کو سامنے لانا ضروری تھا۔ قریش اور یہود کی اس متفقہ سازش نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی۔ بنو نضیر نے خیبر پہنچنے کے بعد قریشِ مکہ کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ وہ پہلے ہی سے آمادہ بیٹھے تھے۔ پھر یہ قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے، اور انہیں بھی جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔ قبیلہ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق کی بنا پر وہ بھی شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ بنو سعد کا

جنگِ احزاب

قبیلہ یہود کا حلیف تھا وہ بھی آمادہ ہو گیا چنانچہ یہ تمام طاغوتی قوتیں اپنے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر حق کے مقابلہ کے لیے یکجا ہو گئیں کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ۔ اسی جہت سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی مختلف جماعتوں کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ۔ یہ لشکرِ جرار آندھی کی طرح اٹھا اور مدینہ کے مضافات تک آ پہنچا۔ بنی قریظہ کے یہود جنہوں نے مسلمانوں سے عہد کیا تھا، ابھی تک الگ تھے۔ لیکن بنی نضیر کی ترغیب سے یہ بھی مخالفین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور اب کفار اور یہود کی پوری قوتیں حق کے مقابلہ میں آ گئیں۔ تصادم و تزاحم کا یہی وہ ہجوم تھا جس کی تصویر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (۳۳

(اے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو) جب وہ لوگ (یہود و کفار) تم پر اوپر اور نیچے ہر طرف سے (دندناتے) کر کے آ چڑھے تھے اور دہشت کے مارے تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور حالت یہ تھی کہ کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا (اور جو تم میں سے کمزور تھے) ان کے دل میں اللہ کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعتِ مومنین نے بتا دیا کہ ان میں کس قدر قوتِ ایمان پیدا ہو چکی ہے۔ (انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا) حالانکہ وہ بڑی طرح جھنجوڑ ڈالے گئے تھے۔

خندق کی تیاری

نبی اکرمؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت سلمانؓ پارسی کی رائے سے پہلے کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود ایک خندق کے اندر پناہ گزیں ہو کر مدافعت کریں۔ چنانچہ ایک بہت بڑی خندق کھودی گئی۔ اللہ کے ان "مزدوروں" میں خود حضورؐ بھی شامل یہ تھی جماعتِ مومنین کی وہ سپاہیانہ زندگی جس سے باطل کی ہر قوت پر غلبہ حاصل ہوتا تھا۔ یہ معرکہ بڑی اور استقامت کا متقاضی تھا۔ دن رات کی مشقت، بھوک اور خوف کی صعوبت۔ سامنے ایک جمِ غفیر کی طرح متلاطم۔ مسلمانوں کی فوج میں منافقین بھی موجود تھے۔ لیکن منافقت و ایمانِ خالص کی تو پرکھ ہی جاں گداز مراحل میں ہوتی ہے۔ وہ لگے بہانہ سازیاں اور روباہ بازیاں کرنے۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا
وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ
مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (۱۲-۱۳)

اور (یاد کرو) جب وہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ اور نفاق کا مرض تھا۔ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے جھوٹا وعدہ کیا ہے! اور جب ان منافقین کے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب (مدینہ) والو! تمہارے لئے یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں سو (اپنے گھروں کو لوٹ چلو، اور ان میں سے بعض لوگ رسول اللہ سے (گھر جانے کی) اجازت مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ (چونکہ) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں۔ (اس لیے ہمیں واپسی کی اجازت دیجئے۔ اُن کے گھر (قطعاً) غیر محفوظ نہیں ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ (ان بہانوں سے) بھاگنا چاہتے ہیں۔

یہ تمام حیلہ جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ ان کے قلبی رجحانات کفر کی طرف تھے، اگر انہیں ان ہی حالات میں مسلمانوں سے لڑنا پڑتا تو سب سے آگے ہوتے۔ سورہ احزاب کی آیات (۱۳ تا ۲۰) میں انہی

مقررکردہ ثالث کے فیصلہ کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا گیا۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ (۳۳/۲۶)

اور جن اہلِ کتاب نے ان دشمنوں کی مدد کی تھی (خدا) نے ان کو بھی اپنے ان قلعوں سے باہر نکال دیا (جن میں وہ محصور تھے) اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ جن میں سے بعض کو تم نے (میدانِ جنگ میں) قتل کر دیا اور بعض کو گرفتار کر لیا۔

اس طرح اللہ نے ان (دشمنوں) کے اموال و اراضی کا مالک مجاہدین کی جماعت کو بنا دیا۔ اور نہ صرف انہی زمینوں کا بلکہ (مستقبل قریب میں) اُن زمینوں کا بھی جو ابھی تک ان کے قدموں سے پامال بھی نہیں ہوئی تھیں۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۧ (۳۳/۲۷)

اور ہم نے تمہیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں، اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا، اور (ایسی) زمین کا بھی (مالک بنا دیا) جس پر تم نے ابھی قدم تک نہیں رکھا تھا۔ اور اللہ نے ہر بات کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

صـ۴۶ کا فٹ نوٹ

؎ واضح رہے کہ اگر کوئی خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا ہو کہ اس میں اسلامی نظام کی تشکیل کی جائے تو اس خطۂ زمین کی محافظت ہر مسلمان پر فرض ہو گی اور اس کی مدافعت میں جنگ کرنا جہاد اور جان دے دینا شہادت ہے۔ ذریعہ کا تحفظ خود مقصد کا تحفظ ہوتا ہے۔

خریدار صاحبان متوجّہ ہوں!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔

2) To collect funds for the proposed college.

3) To make them politically conscious and educate them in the teachings of Islam alongwith western sciences.

4) To create among them feelings of brotherhood, and

5) To bring the children of Muslim families to a place where they should live and learn together and develop feelings of mutual sympathy."[21]

Alongwith these points he realised the importance of the mother-tongue as the medium of education and progress. But more will be said about it later.

Equipped with this experience and knowledge he was ready to go back to save his "drowning people", people who could not even recognise their saviour. But he was determined to say and do his best, for he had already made his plans while in England to start a new magazine on his return called "Tahzibul-Akhlaq", (Muhammadan Social Reformer). He bought enough newsprint to last a year and prepared a block for the frontispiece of the magazine.

In October 1870, he sailed back home.

[illegible] in "The History of [illegible] Part II pages [illegible]
[illegible] Khan's "History of [illegible]

educated and illiterate, when contrasted with the English in education, manners, uprightness, are as like them as a dirty animal is to an able and handsome man .... I am not surprised if may countrymen are shocked at what I say ..... What I have seen and seen daily, is utterly beyond the imagination of a native of India. If any of my countrymen do not believe what I say, you may certainly put them down as frogs and fishes."[16] He then explains that this is all due to education. "This is all the result of the fact that both the men and the women are educated and that the entire nation sets much store by the cultivation of this beauty and excellence. If the people of India at large could also become educated, then, by virtue of her natural advantages, she could become, if not superior to England, at least its equal."[17]

He then spoke of the innumerable evening study circles where all kinds of subjects were discussed. The general level of education and literacy was noteworthy. He talks about one Miss West who borrowed a serious religious book from him to pass her time when she was ill.[18] Then he is impressed by a maidservant who along with being very efficient, can read and write and enjoys reading her daily newspaper.[19]

Seeing all this he was annoyed "almost beyond control" at the indifference and apathy of his countrymen, and "his first hand contact with western life made him more firm in his conviction that India's salvation lay in discarding its medieval outlook and taking to new ideas and methods."[20]

Hence he spent considerable time in visiting educational institutions, the most important being the Cambridge University. He studied its organisation, its method of working and mode of teaching. He was thus able to form a clear idea of what the needs of his own country were. The idea of establishing a separate college for the Muslims had taken shape in his mind. He wrote about his plans to Mahdi Ali. And then, with the help of his son, Syed Mahmud, (who had been of tremendous assistance to him because of his own ignorance of the English language) and some friends the following points were laid down for the educational programme for the Indian Muslims:

"1) To eradicate from the minds of the Muslims their prejudice against the study of western sciences and literature.

---

16 Ibid pages 183-184.
17 Ibid pages 185-186.
18 Ibid pages 187-189.
19 Ibid pages 194-195.
20 A History of the Freedom Movement Vol.II Part II pages 461-462.

bigotry."[12]

Seeing such philanthropic deeds and such achievements based on the principle of self-help, Syed Ahmed was full of anguish about the char his own people. He wrote thus: "I now ask my fellow-countrymen, humbl respectfully, whether these people are human beings or are we - we, wh engrossed in ourselves like animals, we, who are so lacking in self-reliance we expect the government to do everything for us, educating our boys, educ our girls, even teaching them their religion. It is a thousand pities that this is so really is a crying shame. We are not fit to show our faces to the people of civilised country."[13]

Syed Ahmed's resources were limited and there is a lot more that he woul have liked to see. He was also writing his "Essays on the Life of Muhammad" in answer to Sir William Miur's biography of Muhammad. Nevertheless he wa able to meet many distinguished people and attend functions, mainly through the good offices of Lord Lawrence. He met many Dukes and Lords and attended parties and dinners where he met people of upper class, including the women. He also mixed with the middle class and visited the homes of the poor. He saw departmental stores and met businessmen. He visited museums and parks. He attended the levee of Queen Victoria and the Prince of Wales. He also witnessed the races at Derby. Above all he met Thomas Carlyle of "Hero and Hero Worship" fame and attended readings given by Charles Dickens.

At all these meetings and functions he was impressed by the dignity and refinement of the people as compared to the uncouth and boisterous Indians. He decided to write all this down to the Secretary of the Scientific Society founded by him back home. He warned that he would not "hide the truth for fear of offending the members of your society. If I do so, I should myself be committing the sin with which I charge my compatriots."[14]

In this letter he wrote that no doubt the English showed lack of politeness in contemptuously treating the Indians like animals, but he said that it is our mistake to say that they thought us to be animals. "We are in fact as such."[15]

He further goes on to say that "without flattering the English, I can truly say that the natives of India, high and low, merchants and petty shopkeepers

12 Ibid pages 171-172

13 Ibid page 174.

14 Ibid page 181.

15 Ibid page 183.

From Alexandria he boarded the ship "Poona". With him travelled de Lesseps of Suez Canal fame. He was going back after completing his project. Syed Ahmed was told by a friend that when it was suggested to him that the Canal should be named after him, de Lesseps replied, "I shall feel more grateful and honoured if, instead of the canal being named after me, it is named after France." Syed Ahmed was full of admiration for de Lesseps, and wrote "I aplaud the brave and large-hearted man, who held his country's fame so dear as to equate it with his heart's desire and his personal honour. At the same time I lamented the state of my own people, who are steeped in mutual jealousy, enmity and boastfulness."[9]

Syed Ahmed was sorry that some of the Mediterranean islands, Capri, Corsica and Sardinia were passed by at night, and he missed the home of the brave Garibaldi. "I had a great desire to pay homage to the brave Garbialdi's thatched hut, immensely more honourable and respected than all the big palaces of the Ceasars. I am very sorry that I was deprived of this honour because we passed by at night."[10]

He was thrilled by the well-lit, clean and beautiful streets of Marsailles, Paris, and Versailles, their architecture, public parks and restaurants and inns. His emphasis on cleanliness is noteworthy all through his Journal.

However, he was upset by a painting he saw in the palace of Versaille. It depicted the capture of the women of Abdul Qadir, the former king of Algeria, in a dishonourable manner. "Does it behove the French to hang such a painting in the Palace? .... is it in keeping with the French civilisation?"[11]

Near Bristol he was most impressed by the engineering feat of the English in building the suspension bridge at Clifton. And then commented as follows: "When you consider that these achievements, which were beyond the power of even kings,, are products of the determination, generosity and awareness of the people themselves, your respect for this nation is increased. When you consider further that this is a bridge built only for the public good, and not a king's castle or an amir's palace, or a mausoleum of somebody's father or grandfather, or some Raja Babu's pavillion, the impression made on you is great, indeed, especially if you are an unfortunate Indian full of enthusiasm for your country's progress and, in return, subjected to harsh criticism by your fellow-country-men, whom you know to be steeped in selfishness, self-indulgence, jealousy and

9 Ibid pages 117-119.

10 Ibid page 122.

11 Ibid pages 147-148

paradise. May the curse of God fall on the liars. Dead and gone are the people who used to build pear-studded palaces. Foolish charities of this kind don't build even huts in Heaven.

"The Parsis, on the other hand, have made a lot of progress. They have developed their way of dressing into a fine style; all Parsis, rich or poor, dress alike. They bath and change their clothes regularly and live in a cleanly manner. They also have enterprise; they go to distant places for trade and service and are steadily going ahead in culture and education. They are paying attention to female education and, as there is no purdah system among them, they have established good schools for their girls. Every Parsi knows English and yet is steadfast in the observance of his religion, strictly acting on its injunctions."[6]

This contrast of culture between the Memons and the Parsis as Syed Ahmed sees it is a contrast between the emptiness and stagnation of the medieval ways, and the meaningfulness and virility of the "New Light". In the same way when he sees the Egyptians and the Turks skillfully manning the railways in which he travelled from the Suez to Alexandria he is impressed, all the more so because the wretched Indians cannot do this even, but he laments the fact that they are not creative and scientific enough. "But what is worth pondering in the Egyptian railways is that the carriages, the water pumps, the water towers, the railway track, and all kinds of equipment needed in the railway workshop down to the merest nail, are manufactured in either England or France: not one of these things is made in Egypt or Turkey".[7]

He was very sensitive to cleanliness and considered it all a part of a way of life. About the Egyptians he wrote: "But another regrettable thing about the Egyptians' railway workshop was that it was unspeakably dirty as compared with the English workshop. There was no cleanliness about the railway track and the stations; the lanterns did not seem to have been cleaned for months; the iron ...rs for watering the engines, embossed with beautiful floral designs, were ...ly covered with dirt and scum. The canals I have described earlier were in ... state; nowhere did I see a road on their banks; the earth dug out was still ...undressed

"Undoubtedly neatness and dexterity are inborn in the Europeans. This is ... case with the people of other continents, though the people of some Asian ...ies certainly possess refinement."[8]

6. "Musafirana London" pages 50-52.
7. Ibid pages 10-111.
8. Ibid pages 111-112.

experiences has thus been preserved as a valuable document in the study of Syed Ahmed as an educationist. Hadi Hussain says that his "Travel Journal" shows that he "looked at everything with a student's fresh eyes; but behind the students' eyes was a dedicated teacher's mind, converting everything learnt into a lesson to be imparted."[3] Indeed, his stay in England was "a remarkable piece of self-education, which broadened his outlook and gave him fresh ideas and new hopes."[4] But his was not a blind imitation of the glamourous and the superficial. In fact his later life shows a sense of discrimination and evaluation with reference to some political and social concepts. Hali says that "he saw everything; he ignored the defects of western civilisation and picked up its good features. And this evaluation was not that of a fun loving spectator and tourist, but was seen with the eyes of a patriot, full of anguish, pride and foreboding."[5] The desire to serve his people was intense. He could not bear their backwardness. Even a minutest incident in his daily life would stir in him the desire and the enthusiasm to educate his people. He "burnt his heart" to see the contrast in the progress and the stagnation of the two people, the English and his own, respectively.

In essence, the "Travel Journal" immortalises Syed Ahmed's "awakened" spirit. It expresses his boundless enthusiasm, his intellectual curiosity, his sense of objectivity, his rational and scientific approach. Since this attitude of his touches the fundamental approach to his educational policy, it becomes important and it is well worthwhile to mention some of his comments and thoughts. Here is one on the Memons and Parsis of Bombay:

"The Memons dress well, tie Arab 'amamas' round their heads, ride in 'buggis' and seek to distinguish themselves in sheer vanities. Beyond these things they have made no progress. They are very fond of building mosques. Many a Memon seeks renown by maintaining a charitable mess of some sort with a 'madrasa' attached. There is a paid 'mulla' in charge of the 'madrasa', and the so-called students are all mentally retarded adults, who get free food from the mess, go through the motions of learning a lesson or two a day and then go out to coach Memon children or to collect alms as professional beggars. I was extremely sorry to learn of this state of affairs and thought to myself, 'This is the kind of thing that happens when a people fall on evil days'. These Memons spend a lot of money, but in such a foolish way that they gain nothing, whether spiritually or temporally, except that for a short time, people talk of this or that Memon's 'madrassa' or that a few fanatical 'mullas' flatteringly tell them that by building their 'madrassas' they have built pearl-studded palaces for themselves in

---

3 Hadi Hussain - "Syed Ahmed Khan" page 64.
4 Abdul Hamid - "Muslim Separatism" page 11.
5 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 212.

CHAPTER III

THE GREAT EXPERIENCE

Syed Ahmed, as we have seen, had boldly and honestly accepted the superiority of the British in arms and in wisdom. This had made him unpopular with the ultra conservative elements in the society, the Ulemas. Now he decided to take another step which made him all the more unpopular. He decided to visit England.

Hali says that ever since the "Mutiny" he had been toying with the idea of visiting England and seeing with his own eyes and personally experienceing the causes of British power and progress. As he realished more and more the importance of the role of education in national attitudes and character he felt that his visit to England had become indispensable. He mentioned several times to Hali that "My objective cannot be fulfilled unless I am personally acquainted with the principles and methodology of English education."[1] In his application seeking permission to leave for England[2] he wishes to set an example for other Indians to follow his footsteps, he appeals to the British Indian Government to encourage Indians to visit England so that they can be eye-witness to the peculiar achievements of western culture and civilisation and get some idea about the wealth, power and wisdom of the English and thereby learn a lesson from them in the field of trade, industry, agriculture, medical and charitable institutions and the cleanliness of their cities. This understanding will be good for the welfare of India and create better understanding between the English and the Indians.

Once having decided to go, no obstacle was going to be too big for him. He did not have enough financial resources so he sold his library which contained some rare manuscripts and mortgaged his ancestral home. He left Benares in 1869 and returned to India in October, 1870. His stay abroad thus lasted for a year and five months. He recorded his experiences and observations in the form of articles and letters. Upto October, 1869 they were published in "The Scientific Society Magazine". But his strong language and irritating metaphors annoyed those who were incorrigible. They could hardly be expected to understand Syed Ahmed's sentiments and objectives. So the publication had to be discontinued. But he expressed himself frankly and honestly to his friend Mahdi Ali in the letters he wrote him. This "Travel Journal" was later published in "Tahzibul-Akhlaq", a magazine he started after returning to India. This record of his

---

1 Altaf Hussain Hali - "Hayat-e-Javaid" page 203.

2 Reproduced in Ibid. pages 202-203.

by the Muslims, and no fiery typhoon arose about which it was not alleged that it was raised by the Muslims."[13]

It is in this context that Syed Ahmed's policy of reconciliation can be fully appreciated. His booklet on the "Loyal Muhammedans of India", his analysis of the "Causes of the Mutiny," his "Review of Hunter's "On Indian Mussalmans", his "Commentary on the Bible", his "A Pamphlet on the Injunctions about Eating with People of the Book", his attitude towards the Eastern Question and the dismemberment of the Ottoman Empire - all these were his efforts to pave the way for peace and understanding between the English and the Muslims. They were all very serious and sensitive issues but he rided them over with courage and sincerety. He made the English and the Muslims realise what was best for both of them. Out of the ashes of the old, he was now poised to create a new world.

13. Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 155-156.

Without acquaintance with modern knolwedge and development, the condition of his people could not improve. Translation became all the more necessary because of their prejudice against the English language.11 Thus a "Translation Society" was established in 1864, later to be known as "Scientific Society". It issued a paper of its own, later transformed into Aligarh Institute Gazette. He also established a school in 1863. Earlier, he had opened one in Moradabad in 1859. More will be said about these important developments in the succeeding chapters. What needs to be emphasised here is the importance and the urgency that Syed Ahmed felt about spreading the "New Light" among his people.

Now, to achieve this, India needed peace and law and order. In favour of this policy, concrete examples could be cited from the experience of the immediate past. There had been relative peace after the British occupation of Delhi in 1803. From 1803 to 1857, not only that economic conditions had improved and people enjoyed more affluence, they flourished culturally as well. There is the example of the Delhi College, established in 1827 by the British Resident Commissioner, to impart western knowledge. It produced people like Nazir Ahmed, Altaf Hussain Hali, Zakaullah and other eminent personalities. That is why Syed Ahmed gratefully welcomed peace and the general amnesty declared by Queen Victoria.12 "After a long period of unmitigated slavery", he said, "it was ordained from on high, that the destinies of India should be placed in the hands of an enlightened nation. The Hindu and Muslim governments of the past were stark autocrats, standing neither for the Hindu Dharama nor for Muslim Shariat. They looked upon might as right. The British alone, with their love of probity, justice and toleration are fitted to rule over the vast and varied masses of India ... We cannot expect anything better from Russia, Prussia or any other power."

But there was one serious hitch in taking advantage of this situation and launching his educational programme. This was the estrangement between the English and the Muslims. The fifty years of political and military movement amongst the Muslims, the "Mutiny" for which Muslims were held solely [illegible]sible, and the secret societies and conspiracies by the Frontier group after [illegible] "Mutiny" polluted the atmosphere for Syed Ahmed's programme. In anguish [illegible] exclaimed "No calamity started from heaven which, before reaching the [illegible] not seek the home of the Mussalmans. In all the English newspapers [illegible] that I saw during those days I invariably marked one thing, namely, [illegible] and mischievous except Muslims, Muslims, Muslims. No prickly [illegible] in those days about which it was not said that its seed was sown

[illegible] 179-170.

constitution becomes weak and the working of his various organs loses their balance, he becomes vulnerable to all kinds of diseases. Same is true of a nation. When it declines it does not decline in one aspect of life alone: it takes in its wide sweep everything: religion, ethics, education, truthfulness, honesty, civilisation, wealth, dignity and virility."[7] This indeed is a frightening spectacle for any reformer. Referring to this challenge he added. "Those who wish to strive for reforms on all these fronts, are nonplussed as to how can they reform each one of these evils, one by one. There are too many cancerous growths. But when one considers, one sees that there is no other solution but education."[8]

Thus according to Syed Ahmed, the panacea of all these evils is education. These evils were the manifestation of a distorted vision on life; education must correct that vision. A corrected vision would place everything in perspective and create balance in the life of the people. He indeed had great faith in the role of education in creating an educated mind. His optimism is noteworthy when he says: "All socio-political ills of India may be cured by this treatment. Cure the root and the tree will flourish." Then again: An uneducated human mind is "Like a grey marble block; as long as it is not touched by the hand of a sculptor ..... so long its splendour, its beautiful form, its bewitching colours and its fine designs remain concealed."[9] Syed Ahmed's writings and speeches are replete with such exhortation to his nation, and his faith in the basic goodness of man. What mattered was the inherent potential of the human mind and heart. If that is present, then the rest is upto us as to how this potential is awakened and unfolded. In the speech quoted above he gave examples of some American negroes who were so dedicated to their masters that if the master died or if they were transferred from one master to another, they committed suicide by hanging themselves. Then there is the instance of "sati" when the woman threw herself on the funeral pyre of her husband. Syed Ahmed said that this is a barbaric expression of a noble sentiment. They are noble savages. "They can be refined by the influence of education." Earlier he had said that "man's spirit has to be chiselled into shape by education".[10] Henceforth his manifesto is going to be "educate, educate, educate."

Once being convinced of this, he decided to do something about it. In 1862 he was transferred from Muradabad to Ghazipur. Hali says that inspite of his manifold duties, both official and non-official, he planned to set up a society for the translation of scholarly books from English into the vernacular language.

[illegible] Volume 12 page 249

[illegible]

"madness".[4] He worked and worked hard and there is hardly an aspect of national life that he did not touch and leave his impact on.

One point was very noteworthy at this stage:" Syed Ahmed was terrified of the senseless violence, barbarity and inhumanity committed during the "Mutiny". He wanted to make sure that this would not happen again. But there was more to it than that. His insight into the situation convinced him that Muslims were left far behind in the technology of armed warfare and it was impossible to win on the battlefield for the time being. The fact of the superiority of British arms must be recognised. It was evident in the fact of the Jehad Movement and the activities of the Frontier group in the north for another decade after the complete failure of the "Mutiny" itself. In short, the British had come to stay.

Moreover, Shah Walliullah and his successors, Syed Ahmed Brelvi and Shah Ismail had been pressing upon a political solution, whether it was against the Sikhs or the British. Their main objective was to reinforce political vigour into the Muslims and to rehabilitate the Muslim Empire. Their energies and time were geared to politicising the people with ultimately a military showdown on the battlefield. But this preoccupation of the Muslims with the political problem did not brighten their future. The political movement in fact had exhausted itself by now. B.A. Dar says: "The Muslims, as we have seen were in the active field against the British for more than fifty years and had reaped nothing but moral and physical frustration and disillusionment. Their mental and economic development was strangulated. They had wagered their all and lost it."[5]

Syed Ahmed realised that continuation of this policy, to insist on a political and military decision would only cause further ruination of the Muslims. This kind of a decision will have to be postponed to the distant future. For the present, politics must be eschewed and emphasis should be shifted to other fields. "His assessment of the position of Muslims demanded" says B.A. Dar, "that he should put before them a policy of peace in the political field and of religious and educational reforms in the social field and to this he stuck till the last moment of his life."[6] What had gone wrong with the Muslims was their attitude toward life - their lack of curiosity, their intellectual and unscientific approach, their emotionalism and mysticism, their ancestral worship and lack of creativity, their pessimism and hopelessness. He could see that it was an all round decline and deterioration of national life. While discussing the question of modern education in 1894, he explained this with clarity. "When an individual's physical

4. [illegible]
5. B.A. Dar, "Religious Thought of Syed Ahmed Khan" page 75.

- Continued from December 1987 -

CHAPTER II

THE RISE OF THE PHOENIX

The "Mutiny" was a national tragedy. Both in terms of human losses and suffering and material destruction, the nation was broken. Indiscriminate massacre and loot and plunder of the hidden and hoarded wealth came in the wake of severe reprisals. Individually and collectively, it was a nightmarish experience. Syed Ahmed was no exception to this. He was in Bijnore when the "Mutiny" began. When he came to Delhi where his mother was, he was broken-hearted at what he saw. His friend and biographer Colonel Graham tells us how his mother had taken refuge in the house of a 'Syce' (horse's attendant), had lived on horses grain for five days and had no water to drink for three days. Within a month of this she died in spite of the best medical aid that Syed Ahmed could provide for her. Also Graham narrates how his uncle and nephew were done to death although unarmed and loyal to the British. "But at that dreadful time many innocent men, I grieve to say, suffered for the sins of the guilty," remarks Graham.[1] Devastation of Delhi, his birthplace, was terrible. It is known that after the calamities of the "Mutiny" he avoided going to Delhi, lest all the sad memories of those days were awakened in him. Syed Ahmed felt utter despair and hopelessness at these happenings and he decided to emigrate to Egypt.[2] At the Educational Conference in 1889 in his review of the history of the Aligarh College he recollected his feelings during the post-"Mutiny" period. He said: "At that time I considered it impossible that our people would prosper again, and would receive esteem any more; and I could not bear to behold the condition of the people. For some days I remained in this state of confusion and affliction. Believe me, this grief made me old and turned my hair grey ...... But then, the thought occured to me that it would be very cowardly and unmanly to leave one's country in ruins, and to enjoy a comfortable life in privacy. No! I ought to participate in that misery, and it was national duty to endeavour to relieve the miseries as much as I could. And so I gave up the intention to emigrate, and chose to work for my country."[3]

Syed Ahmed thus took up the challenge with great courage, determination and enthusiasm, qualities that never failed him till the end of his life. He himself wondered how was he thus motivated, but motivated he was to the point of

1. Graham - Life of Syed Ahmed - page 12.
2. Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" footnote page 139.
3. Muqalate Sir Syed - Volume 12 - page 185.